جلد ۵ شمارہ ۱

جنوری تا مارچ ۲۰۱۲

# چیلنج

ایڈیٹر: صبیحہ حسن

## اس کھلے جھوٹ کو، ذہن کی لوٹ کو...

نوآبادیات سے لیکر عالمگیریت تک سرمایہ داری نظام نے انسانیت اور ماحول کے ساتھ بالعموم اور تیسری دنیا کے عوام کے ساتھ بالخصوص ظلم اور ناانصافی کی جو تاریخ رقم کی ہے اس کی مثال پچھلے کسی دور میں نہیں ملتی۔ جمہوریت، انسانی حقوق، ترقی اور خوشحالی کے نعروں کے ساتھ انسانوں کی کثیر آبادی کا استحصال یہ واضح کرتا ہے کہ خوبصورت نعروں کے پیچھے صرف اور صرف مفاد پرستوں کا مفاد کارفرما رہا ہے، انسانی بھلائی، آزادی، امن و انصاف اور حقیقی، پائیدار ترقی نہیں۔ یہاں یہ بتاتے چلیں کہ ایک نیا دھوکہ جو آئندہ کئی سالوں کے لیے بڑی زور شور سے آرہا ہے وہ براؤن اکانومی سے گرین اکانومی کا ہے۔ چیلنج کے اگلے شمارے میں اس پر تفصیل سے بحث ہوگی۔ اس شمارے میں ہم نے صرف سرمایہ داری میں سائنس کی اسیری اور ترقی کے فریب کے کچھ پہلوؤں کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔

پاکستان کے حوالے سے جب ہم زمینی حقائق دیکھتے ہیں تو صاف نظر آتا ہے کہ ہمارا حکمران طبقہ نا صرف سامراجی طاقتوں کا پیدا کردہ ہے بلکہ انہی کے سہارے اپنے آپ کو مضبوط کرتا چلا آرہا ہے۔ اسی لیے پاکستانی عوام ایک وقت میں کئی طرح کے شکنجوں میں پھنسے نظر آتے ہیں۔ محنت کش طبقوں میں دیہی مزدور اور کسان استحصال کی چکی میں بری طرح پسے ہوئے ہیں۔ ترقی کے نام پر ان کی پائیدار زراعت کو سبز انقلاب کے بیج کے ذریعے بری طرح پامال کیا گیا۔ کسان کو پیداوار بڑھانے کی لالچ دلا کر یہ پتہ ہی نہ چلنے دیا گیا کہ کیسے زراعت کو اس کے ہاتھ سے نکال کر بین الاقوامی کمپنیوں کے حوالے کردیا گیا ہے۔ سبز انقلاب کے جادو کے بیجوں نے یوریا، کیمیائی ادویات اور دیگر چیزوں کے استعمال سے پیداوار کو بڑھایا لیکن زمین، صحت اور ماحول کو تباہ کرنے کے ساتھ ساتھ کسان کو شدید معاشی بحران کا شکار کردیا۔ پچھلے سالوں میں زرعی مداخل کی بڑھتی ہوئی قیمت اس بات کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ چھوٹے اور بے زمین کسان اب زمین چھوڑنے پر مجبور ہورہے ہیں جبکہ بڑی بڑی بین الاقوامی کمپنیاں ہماری زمینوں کو کارپوریٹ زراعت کے لیے ہتھیا رہی ہیں۔ بیرونی کمپنیوں کی ہماری زراعت میں دلچسپی بہت زیادہ نمایاں ہے۔ مثلاً پچھلے دنوں کراچی میں منعقد کی جانے والی ایگری ایکسپو نمائش میں امریکی ریاستی ایجنسی یو ایس ایڈ (USAID) بہت واضح طور پر نظر آرہی تھی۔ یو ایس ایڈ جیسے اداروں کے ذریعے امریکہ اپنی دیوہیکل کمپنیوں کے لیے نئی منڈیوں تک رسائی اور قبضہ یقینی بناتا ہے۔ یہ بتانا ضروری نہیں کہ پاکستان میں جینیاتی بیجوں کو آگے بڑھانے میں سب سے زیادہ ہاتھ امریکی زرعی کیمیائی اور بائیوٹیکنالوجی کمپنیوں کا ہی ہے۔ دنیا بھر میں جینیاتی بیج فروخت کرنے والی کمپنیوں میں سب سے بڑی امریکی کمپنی مونسانٹو ہے جسے خیبر پختون خواہ اور پنجاب کی حکومتوں نے بی ٹی مکئی کے فیلڈ ٹرائل کی اجازت دے رکھی ہے۔ اگرچہ حکومت پنجاب نے مونسانٹو کے ساتھ بی ٹی کپاس کے بیج کے حوالے سے معاہدہ نہ کرنے کا خوش آئند فیصلہ حال ہی میں کیا ہے لیکن یہ فیصلہ حکومت کی جینیاتی بیج کے حوالے سے پالیسی کو واضح نہیں کرتا۔ اگر بی ٹی کپاس نقصان دہ ہے تو بی ٹی مکئی غذائی فصل ہونے کی وجہ سے زیادہ نقصان دہ ہے۔ اسی طرح مقامی اور بین الاقوامی جینیاتی بیج دونوں ہی ماحول دشمن ہیں۔ یوں لگتا ہے کہ ہماری حکومتیں وقتی فائدے کو دیکھتے ہوئی جینیاتی بیج پر واضح حکمت عملی اختیار نہیں کرنا چاہتیں۔

اگر محتاج زراعت کے ہاتھوں پاکستانی معیشت کی ریڑھ کی ہڈی جھکی رہی تو ملک کبھی بھی توانا نہیں ہو پائے گا۔ کسان دنیا کے اکثریت ہیں، جمہوریت کو استحکام اور معیشت کو پائیدار ترقی انہی سے مل سکتی ہے لیکن انہیں اس سے پہلے اپنے حقوق کی جدوجہد کے لیے متحد ہونا ہے۔ عالمی کسان دوست تنظیموں کے پیغامات جو ہمیں موصول ہوئے انہیں اس شمارے میں اسی لیے رکھا گیا ہے کہ کسان، مرد اور عورتیں، سمجھ سکیں کہ وہ ایک عالمی تحریک کا حصہ ہوتے ہوئے تنہا نہیں، کرہ ارض کی ایک بڑی اکثریت ان کے ساتھ ہے۔ وہ اخباری مضامین جو چیلنج کے موضوعات اور سوچ کی عکاسی کرتے نظر آئے ان میں سے کچھ کے تراجم بھی اس شمارے کے صفحات میں موجود ہیں۔ ان مضامین کے ذریعے مطالب کی مختلف جہتوں کو سامنے لانے کی کوشش کی گئی ہے۔ زرعی اخباری خبروں کی رپورٹ آخری حصے میں ہمیشہ کی طرح اس دفعہ بھی شامل ہے۔ لیکن اب کی بار چند اہم زرعی موضوعات کے اردگرد بہت سی خبروں کو سمیٹا گیا ہے۔

اس رسالے کے کچھ صفحات صرف چھوٹے اور بے زمین کسانوں کی رائے پر مشتمل ہونے چاہئیں۔ اس لیے اپنے اردگرد کے مسائل، واقعات وغیرہ کو اپنے خطوط یا ای میل کے ذریعہ ہمیں ضرور بھیجیے۔ آپ کی رائے کے ساتھ ہم ان مسائل پر روشنی ڈال سکیں گے جو آپ کی زندگیوں سے زیادہ قریب ہوں۔

### فہرست مضامین

سرمایہ دارانہ سائنس ................... ۲
پائیدار زراعت: ذہنی غلامی کی اسیری ...... ۷
بیج کے ذریعہ قبضہ ................... ۱۲
یوریا کا بحران ................... ۱۳
مصنوعی کھادوں کا مسئلہ ................... ۱۶
اے پی سی کی طرف سے عالمی ........ ۱۷
بیسویں ریو اجلاس ................... ۱۷
بات تو سچ ہے مگر ................... ۱۹
سامراجی قوتوں کا ایک نیا جال ....... ۲۷

چیلنج روٹس فار ایکوٹی (Roots for Equity) نے آکسفیم نویب کے تعاون سے شائع کیا ہے۔

سیکرٹریٹ: اے۔1، فرسٹ فلور، بلاک 2، گلشن اقبال، کراچی
فون،فیکس: 0092 21 3481 3320 فیکس: 0092 21 3481 3321
ای میل: roots@super.net.pk

# سرمایہ دارانہ سائنس کے ہاتھ میں جینیاتی علم

تحریر: عذرا طلعت سعید

زرعی دنیا کے علاوہ صارفین کے گروہوں میں جینیاتی بیج، فصلوں اور جینیاتی غذا کی پیداوار پر گزشتہ دو تین دہائیوں سے شدید بحث چل رہی ہے۔ ایک طرف جینیاتی بیج بنانے والی بڑی بڑی بین الاقوامی کمپنیاں اس نئی ایجاد کو بڑھ چڑھ کر پیش کرتے ہوئے اس کے کئی فوائد بیان کر رہی ہیں، دوسری طرف صارفین، خاص کر مغربی ممالک کے صارفین گروہ، جینیاتی بیج، فصلوں اور غذا کے خلاف بہت تفصیل سے معلومات دیتے ہوئے اس پر شدید تنقید کر رہے ہیں۔

پاکستان میں بھی جینیاتی بیج کے حوالے سے الگ الگ گروہ قائم ہو گئے ہیں جن میں سے تین گروہ کافی نمایاں ہیں۔ ایک طرف غیر ملکی کمپنیاں ہیں جو کہ جینیاتی بیجوں کو پاکستانی زراعت میں متعارف کرانا چاہ رہی ہیں، دوسری طرف پاکستانی کمپنیاں اور زرعی یونیورسٹی کے سائنس دان ملی جلی رائے رکھتے ہیں۔ اس کے علاوہ ایک واضح گروہ کسانوں اور کسان دوست تنظیموں کا ہے۔

## ارتقائی عمل میں توڑ پھوڑ

ان گروہوں کے نقطہ نظر اور جینیاتی بیج اور غذا پر مزید گفتگو سے پہلے ضروری ہے کہ اس بیج کی خصوصیات اور وجہ بحث کو سمجھا جائے۔ جی ایم اوز یا جینیاتی جانور، جینیاتی فصلیں اور بیج کا وجود دراصل تاریخ انسانی میں ایک بہت بڑی تبدیلی ہے۔ جینیاتی تخلیق کا عمل خود قابل غور ہے۔ جینیاتی بیج دو الگ الگ طرح کی زندہ اقسام کے جینیاتی مواد کا غیر فطری ملاپ ہے۔ عام طور سے فطرت میں گندم کے بیج سے گندم کا پودا حاصل ہوتا ہے یا چاول سے چاول، اسی طرح ہاتھی سے ہاتھی کا بچہ ہوتا ہے یا پھر رہو مچھلی سے رہو مچھلی لیکن جینیاتی بیج، پودے یا جانور صدیوں سے فطرت میں پائے جانے والے ارتقا تخلیق کے عمل سے ہٹ کر ہیں۔ پودوں اور جانوروں کے فطری طریقہ افزائش نسل اور ملاپ میں بائیوٹیکنالوجی پر مبنی سائنس ایک بڑی تبدیلی لائی ہے۔ اس عمل میں اب کسی بھی مخصوص پودے مثلاً گلاب کا جینیاتی مواد نکال کر کسی اور پھول یا پودے یا جانور میں ڈالا جا سکتا ہے یا پھر کسی جانور یا جراثیم کا مخصوص جینیاتی مواد نکال کر کسی اور جانور یا پودے کے بیج میں ڈالا جا سکتا ہے۔ اس طرح اس عمل میں جاندار کی تخلیق کے حوالے سے قدرت نے جو دائرہ کار متعین کیے ہوئے تھے وہ سب ختم ہو گئے ہیں۔

یہ سارا عمل صرف سائنسدانوں کی لیبارٹری میں ہی ممکن ہے اور اس کا قدرتی تخلیق جو کہ فطرت اور قدرت میں بے ساختہ ہوتی ہے سے نہ کوئی تعلق ہے اور نہ ہی یہ ممکن ہے۔ اس طرز تخلیق کو اپنانے کا مقصد نئی اشیاء، خاص کر زرعی اشیاء کو مارکیٹ میں لانا ہے مثلاً بی ٹی کپاس کے بیج میں جراثیم بیسیلیس تھورین جینسیس (Bacillus thuringiensis) میں پائے جانے والی ایک زہریلی جین کو کپاس کی جین میں منتقل کر دیا جاتا ہے۔ اس ملاپ سے بی ٹی کپاس کا بیج بنتا ہے۔

انسان نے تخلیق اور تکنیکی ایجاد سے جڑتے ہوئے زمانہ غار سے لیکر انفارمیشن ٹیکنالوجی کی صدی میں قدم رکھا ہے۔ ٹیکنالوجی دراصل خود بے جان ہوتی ہے، وہ نہ سوچ سمجھ سکتی ہے اور نہ ہی اپنے عمل کے طریقے کار پر اثر انداز ہو سکتی ہے۔ ایجادات اور ان کا استعمال ہمیشہ سے ہی انسانی عمل رہا ہے لیکن اس عمل کے ساتھ معاشرتی، سیاسی اور معاشی سوچ جڑی ہوئی ہے۔ انسانی تاریخ میں علم کو تہذیب نے ایک اونچا درجہ دیا ہے اور عام خیال ہے کہ انسانیت کی خدمت کے لیے علم حاصل کیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ علم نہ صرف انسانیت بلکہ دنیا اور تمام حیات اور کائنات کو سمجھنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ لیکن آج سے پانچ سو سال پہلے انسانی تاریخ میں ایک نئی فلسفیانہ سوچ اور فکر غالب آنے لگی۔ اس سوچ کو سرمایہ داری کہتے ہیں۔ سرمایہ داری بذات خود جس نقطہ نظر پر یقین رکھتی ہے وہ منافع کا حصول اور فروغ ہے جو کہ صرف طبقہ وارانہ تفریق کو قائم رکھنے اور بڑھانے سے ہی ممکن ہے۔ سرمایہ داری نے علم اور سائنس کی اہمیت کو جانتے ہوئے اس کو اپنے قابو میں کرنا شروع کیا اور سائنس کے ذریعے ہر زاویے سے تحقیق کرتے ہوئے نئی نئی اشیاء اور خدمات کی پیداوار شروع کر دی۔ کرہ ارض پر جو بیش بہا خزانہ قدرت نے انسان کے لیے رکھ چھوڑا تھا اس کو سرمایہ داری نے نجی اور ذہنی ملکیت کے سہارے مضبوط کر کے مزید منافع حاصل کرنے کے لیے استعمال کیا۔ سرمایہ داری کے تحت سائنس کی مشینی ایجاد خصوصاً اسٹیم انجن، نے سرمایہ دارانہ سوچ اور عمل کو پھیلانے میں بہت بڑا کردار ادا کیا۔ اس نظام سے پہلے جاگیر داری نظام میں جاگیر دار نجی ملکیت کو استعمال کرتے ہوئے اپنے ہی علاقے میں موجود زمین اور اس سے حاصل ہونے والی قدرتی اشیاء پر مزدور کی محنت کا استحصال کرتے ہوئے اپنے لیے دولت جمع کرتے تھے۔ لیکن سرمایہ داری نے نہ صرف اپنے اردگرد سے خام مال حاصل کیا بلکہ اس نے تیل اور کوئلے سے چلنے والی مشینری اور ذرائع نقل و حمل کو فروغ دیتے ہوئے ساری دنیا اور اس کے وسائل پر قبضہ کرنا شروع کر دیا۔ سرمایہ داری تاریخ میں نوآبادیات کا کالا دھبہ پیوست کرتے ہوئے اب عالمگیریت کے دور تک پہنچ چکی ہے۔ ان پانچ سو سالوں میں "مشعل علم" اب بڑی مضبوطی سے سرمایہ داری کے ہاتھ میں ہے۔

آج دور عالمگیریت میں ایجادات اور ٹیکنالوجی کو سرمایہ داری کے اصولوں پر مرتب کیا جا رہا ہے یعنی اب علم کا استعمال اگر انسانی بھلائی کو نظر میں رکھتا ہے تو یہ بے لوث خدمت کے طور پر پیش نہیں ہوتا بلکہ اب اس پر رقم لگائی جاتی ہے۔ ہر مارکیٹ میں طبقے کی بنیاد پر اشیاء اور خدمات کی بولی لگتی ہے۔ ایک طرف مزدور طبقے کو اس کی محنت کی کم اجرت دیتے ہوئے اس کو زبردستی مفلس اور محتاج رکھا جاتا ہے تو دوسری طرف اس کی قوت خرید کو مدنظر رکھتے ہوئے اسے منافع کی بنیاد پر اشیا اور خدمات بیچی جاتی ہیں۔ اس طرح سرمایہ دار طبقہ محنت کی کم اجرت دیتے ہوئے خام مال پر قبضے کے ساتھ ایک طرف اپنے لیے سستی پیداوار حاصل کرتا ہے تو دوسری طرف مہنگی سے مہنگی اشیاء و خدمات بیچتے ہوئے بے تحاشہ منافع کما کر

طبقاتی نظام کو تقویت دیتا ہے۔

اس منافع کمانے کی دوڑ میں سرمایہ دارانہ سائنس منڈی میں فروخت ہونے والی اشیاء کے بارے میں اشد ضروری تحقیق یا جانچ پڑتال پر کم سے کم توجہ دیتی ہے جس سے پتہ چلے کہ وہ اشیاء انسانی ضرورت، صحت اور ماحولیاتی صحت کے لیے بہتر اور سودمند بھی ہیں کہ نہیں؟ ساتھ ساتھ یہ کوشش بھی ہوتی ہے کہ مضر اثرات کو یا تو بالکل بیان ہی نہ کیا جائے یا اسے سرے سے نظر انداز کیا جائے۔ سرمایہ دارانہ سائنس سنگین سے سنگین صحت یا ماحولیاتی مسائل کی پردہ پوشی کرنے کے لیے بھی تیار رہتی ہے۔

## سرمایہ دارانہ زرعی سائنس کا کردار

اس پس منظر میں اگر غور کیا جائے تو جینیاتی بیج اور دیگر جینیاتی اشیاء کی بحث دراصل دو گروہوں میں ہے۔ ایک طرف سرمایہ دار کمپنیاں اور ان سے جڑے وہ گروہ ہیں جو اپنے منافع کو محفوظ کرنے کے لیے اس ایجاد کا ساتھ دے رہے ہیں۔ دوسری طرف وہ گروہ ہیں جو حیاتیاتی ارتقاء، انسانیت، ماحولیات اور انسانی صحت کے حوالے سے فکرمند ہیں۔ بات ظاہر ہے کہ سرمایہ داری کے تحت جن سائنس دانوں نے جینیاتی بیج ایجاد کیا وہ اسی لیے اس ٹیکنالوجی کو تحفظ دینے پر اصرار کر رہے ہیں۔ کمپنیاں ہی سائنسدانوں کے مہنگے ترین اخراجات جن میں قیمتی آلات کے علاوہ سائنس دانوں کا بھاری معاوضہ وغیرہ ادا کر کے جینیاتی تحقیق و ایجادات کو فروغ دیتی ہیں۔ زیادہ تر زرعی جینیاتی بیجوں کی پیداوار زرعی کیمیائی کمپنیاں کر رہی ہیں۔ ان کمپنیوں کے بارے میں رائے قائم کرنے کے لیے ان کی پیداواری تاریخ اور صارفین کے ساتھ ماضی میں تعلقات کی بنیاد پر کچھ فیصلے کیے جا سکتے ہیں۔

ہمارے پاس پچھلے تقریباً ۶۰ سال کا تجربہ ہے جس کی بنیاد پر ہم زرعی سائنس اور ٹیکنالوجی کو پرکھ سکتے ہیں۔ اس شعبہ میں ایجاد کی بنیاد کیا بنائی گئی؟ کیا تکنیکی جدت انسانی بھلائی کے لیے استعمال کی گئی یا پھر منافع کمانے کے لیے؟ اس کے علاوہ ان کی اشیاء کے اثرات اور زرعی کیمیائی صنعت کی جوابی کاروائی پر بھی نظر دوڑانی ضروری ہے۔

دوسری جنگ عظیم کے فوراً بعد ہی امریکی زرعی کمپنیوں اور نجی شعبے نے سبز انقلاب متعارف کروایا تھا۔ سبز انقلاب نے یوریا اور دیگر کیمیائی اشیاء کو فروغ دیا۔ کیمیائی کھاد میں سب سے زیادہ پوٹاش کا استعمال ہوتا ہے جو کہ بارود میں بھی ڈالا جاتا ہے۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد امریکی کمپنیوں کے پاس اسلحہ و بارود بنانے کا پوٹاش بڑے پیمانے پر بچ گیا تھا تو امریکی سائنس دانوں نے اس کو زرعی اشیاء میں ڈالنا شروع کر دیا۔ اس کے علاوہ ایجنٹ اورنج نامی ایک اور کیمیکل جو کہ ویت نام کی جنگ میں امریکیوں نے استعمال کیا تھا، کا بھی نیا استعمال ڈھونڈ لیا گیا۔ ایجنٹ اورنج ویت نام کے گھنے جنگلوں پر اس لیے پھینکا گیا کہ پتے اور دیگر سبزہ جھڑ جائے تاکہ چھپے ہوئے ویت نامی جو کہ امریکی فوج کا مقابلہ کر رہے تھے ڈھونڈے جا سکیں۔ جنگ ختم ہونے کے بعد ایجنٹ اورنج کو کیڑے مار مواد کے طور پر پیش کیا گیا۔ ظاہر ہے کہ یہ ایجادات امریکی سائنس دانوں کے ذریعہ ہی سامنے آئیں جن کی امریکی حکومت اور نجی منافع خور شعبے نے بڑھ چڑھ کر مدد کی۔

سبز انقلاب متعارف ہونے کے صرف ۲۰ سال کے بعد ہی صارفین کے ایک بڑے گروہ نے زراعت میں کیمیائی اشیاء کی صحت اور ماحولیات پر خطرناک اثرات کے بارے میں معلومات فراہم کرنی شروع کر دی تھیں۔ کئی سائنسی تحقیقات منظر عام پر آئیں جس کے نتیجے میں زرعی کیمیائی اشیاء پر پابندی لگانے کی بھرپور کوشش کی گئی۔ زراعت میں کیمیائی کھاد اور زہریلی ادویات کے استعمال سے پچھلے ۶۰ سال کے عرصے میں کئی ہزار اموات ہو چکی ہیں۔ ہزاروں لوگ جن میں دیہی مزدور اور دیہی آبادیوں کے افراد شامل ہیں، کئی مہلک بیماریوں کا، جن میں کینسر شامل ہے، نشانہ بن چکے ہیں۔ تقریباً ہر زرعی ملک سے زہریلی کیڑے مار ادویات کو پی کر خودکشی کرنے کی خبریں بھی عام ہوئیں۔ اس کے علاوہ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ کیمیائی کھاد زمین کے لیے نشے جیسا اثر رکھتی ہے اور اس کے استعمال سے زمین اپنی قدرتی زرخیزی کھو بیٹھتی ہے۔

زرعی کمپنیوں یا ان سے جڑے سائنس دانوں نے ان تحقیقات یا اثرات پر کوئی ایسا سنجیدہ قدم نہیں اٹھایا ہے کہ جس سے زرعی زمین کی زرخیزی، انسانی اموات اور تکالیف کا مداوا ہو سکے۔ زرعی کمپنیوں نے اپنی ایجادات کے ذریعے مزید منافع کمانے کے لیے انسان دوست سائنس کی آواز کو تقریباً خاموش کر دیا ہے۔ دنیا کی طاقتور حکومتیں اپنی سرمایہ دارانہ کمپنیوں کے مفادات کے تحفظ کو سب سے پہلے نظر میں رکھتی ہیں۔ پھر وہ کچھ حفاظتی اقدامات لاگو کرتے ہوئے نا صرف زہریلی ادویات اور کیمیائی کھاد کی فروخت کو جاری رکھتی ہیں بلکہ منڈی میں ان کی فروخت کو کئی گنا بڑھانے کا اہتمام بھی کرتی ہیں۔ مثلاً پاکستان میں زہریلی کیڑے مار ادویات کا استعمال ۱۹۸۰ء میں ۹۰۶ میٹرک ٹن سے بڑھ کر ۱۹۹۲ء میں ۵,۵۱۹ میٹرک ٹن ہو گیا۔ اسی طرح ۱۹۸۶ء–۱۹۸۸ء میں پاکستان نے ۲۰۴ ملین روپے کی کیمیائی کھاد خریدی تھی اور دس سال کے عرصے کے بعد یعنی ۱۹۹۷ء–۱۹۹۸ء میں ۱۳۳۱ ملین روپے کی کھاد بین الاقوامی منڈی سے خریدی گئی۔[۱] اسی طرح زہریلی کیڑے مار اشیاء کی مارکیٹ ۱۹۹۰ء میں ۲ء۷ بلین روپے سے بڑھ کر ۲۰۰۰ء میں ۱۱ بلین روپے ہو گئی۔[۲]

## بائیوٹیکنالوجی سائنس سرمایہ داری کے ہاتھ میں

اس تلخ تاریخ کے بعد ہم ایک دفعہ پھر ایک نئی یعنی جینیاتی ایجاد کو پہلی اور تیسری دنیا کی آبادیوں پر مسلط ہوتا دیکھ رہے ہیں جس کے بارے میں شدید تشویش اور تحفظات پائے جاتے ہیں۔ ایسے سائنسدان جو کہ جینیاتی اشیا اور فصلوں پر تنقید کر رہے ہیں تقریباً چپ کروا دیے گئے ہیں۔ کوئی سائنس دان اگر جینیاتی تجربات پر کوئی تشویشناک تحقیق شائع کرتا ہے تو اس کو بائیوٹیکنالوجی انڈسٹری بدنام کر کے ان کی تحقیق کو ناقابل توجہ بنا دیتی ہے۔ مثلاً پیک ہاس ایک مضمون میں بیان کرتے ہیں کہ ڈاکٹر ای این کلارک ایک ایسی سائنس دان ہیں جن کی آواز کو بائیوٹیکنالوجی سائنس میں کم جگہ دی جا رہی ہے کیونکہ وہ اس سائنس پر اپنے تحفظات کو ظاہر کرتی ہیں۔ ڈاکٹر کلارک جو کہ یونیورسٹی آف گیولف (Guelph) کے پلانٹ ایگریکلچر ڈیپارٹمنٹ میں ایسوسی ایٹ پروفیسر ہیں کا کہنا ہے کہ "اب ایسی تحقیق کی طرف تقریباً کوئی رجحان نہیں ہے جو جینیاتی انجینئرنگ کے منفی اثرات کو ابھارے"۔[۳] ان کے

خیال میں ''اگر کسی کو ٹیکنالوجی کے فروخت سے فائدہ ہے تو وہ پھر کیوں اس ٹیکنالوجی کے نقصانات/خدشات کی تشخیص کروائے؟'' مزید یہ کہ بائیوٹیکنالوجی کی وکالت کرنے والے لوگ اکثر ''سائنس کی بنیاد'' پر فیصلہ سازی کا ذکر کرتے ہیں جبکہ دراصل اب اس فیصلہ سازی میں بہت کم سائنس کا دخل ہے۔ ان کے اس قسم کے اعتراضات کی بنیاد پر پچھلی دہائی میں ڈاکٹر کلارک کے تحقیقی بجٹ میں شدید کٹوتی کردی گئی اور ان کو اپنی پہلی تحقیقی لیبارٹری سے منتقل کردیا گیا ہے۔ اسی قسم کے خیالات ڈاکٹر رینے وین ایکر کے بھی ہیں جو کہ یونیورسٹی آف گیولف میں پلانٹ ایگریکلچر ڈیپارٹمنٹ کی چیئر ہیں۔ ڈاکٹر ایکر کا خیال ہے کہ ''جینیاتی انجینئرنگ کے اثرات پر تمام ضوابط کا سختی سے لحاظ کرتے ہوئے ٹھوس اور لمبے عرصے تک کی تحقیق صرف مالیاتی وسائل کی کمی کی وجہ سے نہیں کی جارہی ہے لیکن اس سے زیادہ بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ اگر تحقیق کی بھی جائے تو ٹیکنالوجی بنانے والے ایسی تحقیق میں تعاون نہیں کریں گے''۔[۴] کچھ سائنسدان ابھی تک انسان اور ماحول دوست اقدار کو قائم رکھتے ہوئے سائنس کے اس استعمال پر شدید تنقید کررہے ہیں۔ زیادہ تر وہ سائنسدان آواز اٹھا رہے ہیں جو صارفین کے گروہوں سے جڑ کر اپنی تحقیقات منظر عام پر پہنچا پا رہے ہیں۔

اس حوالے سے پاکستان کے سائنس دان طبقہ، بائیوٹیکنالوجی اداروں اور کمپنیوں پر بھی ایک نظر ڈالنی چاہیے۔ پاکستان میں اب تک صرف ایک جینیاتی فصل یعنی بی ٹی کپاس بڑے پیمانے پر اگائی جارہی ہے۔ بی ٹی کپاس کے بیج کو پہلے آسٹریلیا اور پھر ہندوستان سے غیر قانونی طور پر لایا گیا تھا۔ اس بیج کو اب پاکستان میں بھی تحقیق کے ذریعہ تیار کیا گیا ہے اور اسے پاکستانی کمپنیاں فروخت کررہی ہیں۔[۵] پاکستانی سائنس دان اور ڈسٹری بیوٹرز نے پچھلے کئی مہینوں سے حکومت پاکستان سے مطالبہ کیا ہوا ہے کہ ہم کو پاکستان میں بین الاقوامی زرعی کیمیائی کمپنی مونسانٹو کے بی ٹی کپاس کے بیج کو نہیں منظور کرنا چاہیے۔[۶] پاکستانی سائنسدانوں اور ڈسٹری بیوٹرز کا کہنا ہے کہ ان بیجوں کے آنے سے پاکستان کو بھاری نقصان ہوگا کیونکہ غیر ملکی زرعی کمپنی مونسانٹو کا بی ٹی کپاس کا بیج بہت مہنگا ہوگا۔ یہ واضح ہے کہ امریکی کمپنی مونسانٹو کے خلاف اٹھنے والی آواز میں پاکستان کے بڑے زمینداروں کی آواز شامل ہے۔ ان کے مطابق وہی ٹیکنالوجی جو مونسانٹو فراہم کررہی ہے وہ چین اور جرمنی کی کمپنیاں مفت فراہم کررہی ہیں۔ اس حالت میں مونسانٹو سے مہنگے بیج کیوں حاصل کیے جائیں؟ اس کے علاوہ اس سے زیادہ اہم نکتہ یہ ہے کہ مونسانٹو اپنی بی ٹی کپاس کے بیج پر ذہنی ملکیت کے معاہدے یعنی آئی پی آر کو منوانا چاہ رہی ہے۔ خبر یہ بھی ہے کہ وہ حکومت پاکستان پر زور ڈال رہی ہے کہ مونسانٹو کے بی ٹی کپاس کے بیج کو کسانوں کو اگلے سال کی فصل کے لیے محفوظ رکھنے اور آپس میں اس بیج کا تبادلہ کرنے کی اجازت نہ دی جائے۔[۷]

۳ جنوری ۲۰۱۲ء، روزنامہ ڈی نیوز کی ایک خبر کے مطابق پاکستان میں سب سے زیادہ کپاس پیدا کرنے والے صوبے پنجاب کی حکومت نے مونسانٹو کی بی ٹی کپاس پر پابندی کا فیصلہ مندرجہ ذیل وجوہات کی بنا پر کیا ہے:

- پنجاب میں بی ٹی کپاس کو سب سے زیادہ نقصان پتہ مروڑ (کاٹن کرل) وائرس ہے اور بیسیلیس تھورین جینسیز (بی ٹی) کپاس میں اس بیماری کا کوئی تدارک نہیں۔
- بی ٹی کپاس کی کاشت پر زیادہ لاگت اور کم پیداوار کی وجہ سے ہندوستان کے کسان قرضوں میں ڈوب گئے ہیں۔
- ملی بگ کا کیڑا ایک اور خطرے کی صورت میں سامنے آیا ہے اور جینیاتی تبدیلی کے ذریعے تیار کیے جانے والے بی ٹی کپاس کے اس بیج نے اسے بڑھایا ہے۔
- ہندوستان میں بی ٹی کپاس پر کی گئی کیس اسٹڈی پیداوار میں اضافے کا دعویٰ رد کرتی ہے۔
- اس ٹیکنالوجی کی وجہ سے دیگر نباتات اور ماحولیات پر بہت زیادہ نقصان دہ اثرات مرتب ہو رہے ہیں۔
- انسانی صحت پر مضر اثرات جس میں خارش کی علامات کے ظاہر ہونے کے علاوہ بی ٹی کپاس کے کھیتوں کا چارہ کھانے والے جانوروں میں بھی اس کا زہریلا مادہ پایا جاتا ہے۔ جس کی ایک مثال پنجاب کے کچھ علاقوں میں جانوروں کا بیمار ہونا ہے۔ اس کی وجہ بی ٹی کپاس کے بیج سے بنائی گئی کیک (جانوروں کی خوراک) بتائی جاتی ہے۔
- بی ٹی کپاس کی پیداوار موسم کے دباؤ کو برداشت نہیں کرسکتی کیونکہ اسے سرد موسم کے لیے بنایا گیا ہے۔

وزیرزراعت حکومت پنجاب محترم احمد علی اولاک نے مزید کہا کہ جینیاتی طور پر تبدیل کیے گئے کپاس کے بیج میں مسائل کے حل کے لیے کوئی تدابیر نہیں اور یہ غریب کسانوں کے لیے انتہائی مہنگا ہے۔ گو کہ یہ نہایت خوش آئند قدم ہے لیکن سمجھنے کی ضرورت ہے کہ حکومت پنجاب کیوں مونسانٹو کے بیج کو رد کرتے ہوئے پاکستانی بی ٹی کپاس کو فروغ دے رہی ہے؟ پنجاب کے کھیتوں میں مونسانٹو ہی کی تیار کردہ جینیاتی مکئی کے بیج پر تحقیق کی اجازت کیوں دی گئی ہے؟ دیگر یہ کہ ہماری درس گاہیں اور دیگر بائیوٹیکنالوجی کے تحقیقی ادارے بی ٹی کے بیجوں اور دیگر جینیاتی بیجوں پر کیا نقطہ نظر رکھتے ہیں؟

سب سے اہم پہلو یہ ہے کہ پاکستانی بی ٹی کپاس اور مونسانٹو بی ٹی کپاس کی بحث جینیاتی بیج اور اشیا کے بارے میں ابہام پیدا کرتی ہے۔ بنیادی مسئلہ کسی بھی جینیاتی بیج یا فصل کا ہے، صرف بی ٹی کپاس کا نہیں۔ کیونکہ یہ ایجاد فطری افزائش نسل اور حیاتیاتی ارتقاء کے تسلسل کو توڑ کر غیر فطری طریقہ کار کی بنیاد پر زندہ اقسام کو منڈی میں فروخت کرنے والی اشیا کی حیثیت سے متعارف کرواتی ہے۔ یقیناً یہ کل حیات کی تخلیق کے لیے ایک شدید مسئلہ ہے۔ دوسری طرف کسی بھی زندہ شے کو انسان کی نجی ملکیت قرار دینا انتہائی غیر اخلاقی عمل ہے۔

اس سائنس میں خود کافی جھول ہے۔ سب سے پہلے تو ظاہر ہے کہ قدرت میں کبھی بھی ایسا نہیں ہوسکتا کہ جانور اور پودوں کا جینیاتی مواد ایک دوسرے سے مل سکے۔ یہ عمل صرف لیبارٹری میں ہی ہوسکتا ہے اور کیونکہ یہ ارتقاء کے عمل سے بالکل ہٹ کر ہے تو ہم پورے حیاتیاتی نظام کو متزلزل کر رہے ہیں۔ جینیاتی مواد، حیات میں کئی جگہ خاص ترتیب میں پایا جاتا ہے۔ جینز کا لمبا حصہ خاموش ہوتا ہے اس کو کچرا (junk) بھی کہا گیا ہے۔ لیکن دیکھا گیا ہے کہ کچھ جینیاتی مواد جن کو جمپنگ جینز (jumping genes) کہتے ہیں خود بخود مختلف جینیاتی مواد کے حصوں میں چلے جاتے ہیں اور پھر وہاں سے نکل بھی جاتے ہیں لیکن ساتھ تھوڑی تبدیلی بھی کردیتے ہیں۔ یہ سارا عمل ابھی تک مکمل طور پر نہیں سمجھا گیا ہے۔ ساتھ

ساتھ یہ بھی کہ جینیاتی مواد ماحول کا اثر لیتا ہے اور اپنے اندر تبدیلی لاتا جاتا ہے جو کہ ارتقائی عمل کا حصہ ہے۔ انسان کا اس لیے جینیاتی مواد کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنا کئی طرح کی تبدیلیوں کو جگہ دے سکتا ہے اور حیاتیاتی نظام میں بگاڑ پیدا کرسکتا ہے۔[۸] اب اگر ہم اس طرح سے جینیاتی مواد جانوروں سے جانور، جانوروں اور جراثیم سے پودوں اور پودوں سے جانوروں میں منتقل کرتے ہیں تو ابھی دنیا کا کوئی سائنسدان یقین سے نہیں کہہ سکتا ہے کہ اس کا کیا نتیجہ ہوگا۔

جیسا کہ اوپر دی گئی اخباری خبر میں حکومت پنجاب کے وزیر نے بھی بیان کیا کہ کئی تحقیقات اب کپاس کے جینیاتی بیج یعنی بی ٹی کپاس کے بارے میں کئی خطرناک مسائل کی نشاندہی کرچکی ہیں۔ اس کے علاوہ بی ٹی کپاس میں زہریلا جینیاتی مواد بیج میں سے پھیل کر پودے کی جڑوں سے ہوکر زمین میں بھی پہنچ جاتا ہے۔ اسی طرح بی ٹی کپاس ایک خاص قسم کی تتلی (مونارک تتلی) کے لیے زہریلا ثابت ہوا ہے۔ سوال پھر وہی ہے کہ کیا یہ مسائل پاکستان میں تیار کردہ بی ٹی کپاس میں نہیں پائے جاتے؟ ان سوالات کا جواب شاید ہم کو اپنے ملک کی درس گاہوں اور سائنس دانوں سے نہیں بلکہ سامراجی طاقتوں کی یونیورسٹیوں اور سائنس دانوں سے زیادہ واضح طور پر حاصل ہوسکتا ہے۔

جینیاتی سائنس دراصل نیولبرل ازم یا آزاد تجارت کے اصولوں سے الگ نہیں جو کہ عالمگیریت کے مضبوط ستون ہیں۔ پہلی دنیا کی کئی یونیورسٹیوں میں بنیادی تحقیق کے شعبوں میں کاروباری شعبے کو اہمیت دی گئی ہے۔ مثلاً کینیڈا کی حکومت نے کچھ بڑی یونیورسٹیوں، جن کو حکومت کی طرف سے تحقیق کے لیے مالی امداد حاصل تھی، کچھ اصول بنائے ہیں۔ تحقیقی شعبوں میں کاروباری شعبے کے نمائندوں کو اہم پالیسی بنانے والی کمیٹیوں میں جگہ دینی پڑی ہے، خاص طور پر تحقیقی پروجیکٹ کے چناؤ میں۔ نمائندے یہ فیصلہ کرسکتے ہیں کہ کونسی تحقیق کرنی چاہیے اور کیا ان پر وسائل لگانے چاہیں؟ اس پورے سلسلے کو ڈاکٹر پیک ہاس کچھ یوں بیان کرتے ہیں: ''وفاقی حکومت کے فروخت پر مبنی تحقیقی پروجیکٹ پر توجہ نے تعلیمی درس گاہوں میں آزاد تجارت کی قدروں کو معمول بنادیا ہے اور اب آج کی یونیورسٹی سرمایہ داری کے قبضے میں آ گئی ہے''۔[۹] دوسرے لفظوں میں اصل توجہ ایسی جینیاتی تحقیق پر ہے جو کہ جلد از جلد نئی اشیاء پیش کرسکے اور پھر مارکیٹ میں فروخت کے قابل بناسکے۔ تجارتی کے عمل کو سائنسی تحقیق میں یوں داخل کیا گیا ہے کہ تمام فیصلے حقیقی (objective) تحقیق اور نتائج پر نہیں کیے جاتے بلکہ منافع کے حصول کی بنیاد پر کیے جاتے ہیں۔ جب سے سائنس نے جینیاتی مواد کی باریکیوں پر معلومات حاصل کرتے ہوئے جینیاتی مواد کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنا سیکھا ہے تو اس کے تحت کئی ہزار نئی ایجادات کو مارکیٹ تک پہنچا کر منافع کمانا بائیو ٹیکنالوجی کمپنیوں کا اولین مقصد ہوچکا ہے۔

امریکی یونیورسٹیوں میں بیج پر تحقیق کا عمل ۱۹۲۰ء کی دہائی میں شروع ہوگیا تھا۔ اس عمل کے تحت پہلی دفعہ جب ہائی برڈ مکئی کے بیج سامنے آئے اور اس سے پیداوار میں بے تحاشہ اضافہ ہوا تو نجی زرعی شعبہ نے جلدی تحقیق کے عمل میں حصہ لینا شروع کردیا۔ لیکن اس کے باوجود بڑے پیمانے پر گورنمنٹ یونیورسٹیوں میں عوام اور کسان کی بہبود کے لیے زرعی تحقیق جاری رکھی گئی۔ یہاں تک کہ کمپنیوں کے تیار کردہ بیج پر اور اس تمام معلومات کو خفیہ رکھنے کے لیے جوابی کاروائی کی گئی تا کہ کسان کمپنیوں کے کاروبار اور منافع خوری کے لائحہ عمل سے بچ سکیں۔[۱۰] ۱۹۲۰ء کی دہائی میں ہائی برڈ مکئی کی دریافت کے بعد ۱۹۸۰ء کی دہائی (دور گلوبلائزیشن) میں بیج کی تحقیق کے حوالے سے نیا دور شروع ہوتا ہے۔ اس دور میں گورنمنٹ یونیورسٹیوں میں بیج اور بائیوٹیکنالوجی کے حوالے سے تحقیق کی جارہی تھی وہ نجی کمپنیوں کے لیے نہایت اہم ہوگئی۔ یونیورسٹی میں موجود سائنسی علم سرمایہ داروں کے لیے رکاوٹ تھا کیونکہ یہ علم منافع حاصل کرنے میں حائل تھا۔ یونیورسٹیوں میں رجحان سرمایہ داری کی طرف کم اور علم پھیلانے کی طرف زیادہ تھا۔ اس مسئلے کا حل یونیورسٹیوں میں موجود سائنس دانوں کو ایک طرف اپنی کمپنیوں کی لیبارٹیوں میں بھرتی کرکے اور دوسری طرف گورنمنٹ یونیورسٹی کے سائنس دانوں کو زرعی کمپنیوں نے اپنے اداروں میں کنسلٹنٹ (ماہرانہ مشورے فراہم کرنے والے) کی حیثیت سے جگہ دے کر نکالا۔ ۱۹۸۳ میں ایگری جینیٹکس (Agrigenetics) جو کہ ایک نئی بائیوٹیکنالوجی کمپنی تھی نے مختلف یونیورسٹیوں سے وابستہ سائنس دانوں کو کنسلٹنٹ کے طور پر رکھا ہوا تھا اور اسی سال ایگری جینیٹکس ۱۸ یونیورسٹیوں میں تحقیقات کے لیے مالی امداد فراہم کررہی تھی اور ہر پروجیکٹ ۵۰۰,۰۰۰ سے ۲ ملین امریکی ڈالر کا تھا![۱۱]

پیک ہاس کا کہنا ہے کہ نیولبرل سوچ کئی حکومتوں پر حاوی ہے جس میں کینیڈا کی حکومت بھی شامل ہے۔ اس سوچ نے ایک ایسے ''سچ'' کو جگہ دی ہے جو یہ جتلاتا ہے کہ معاشی ترقی نجی کاروبار کی صلاحیت پر مبنی ہے کہ وہ کیسے یونیورسٹی اور درس گاہوں کے علم اور ایجاد کا استحصال کرتے ہوئے اسے کاروباری استعمال میں لائے۔[۱۲] پاکستان کے حوالے سے اگر ہم ''سچ'' کو سمجھنے کی کوشش کریں تو تحقیق کے لیے قائم کردہ ادارے جو کہ ملک بھر میں کئی مقامات پر قائم کیے گئے ہیں پر نظر ڈالنی چاہیے۔ یہ ادارے ''آفیس آف ریسرچ، انوویشن اینڈ کمرشیلائزیشن (یعنی دفتر برائے تحقیق، جدت اور کاروباری عمل) کے نام سے جانے جاتے ہیں جن کو ہائیر ایجوکیشن کمیشن (HEC) نے قائم کیا ہے۔ ہائیر ایجوکیشن کمیشن (ایچ ای سی) کا مقصد ان کی ویب سائیٹ پر دی گئی معلومات کے مطابق[۱۳] پاکستان میں ایک ایسے ریسرچ سیکٹر کا انعقاد کرنا ہے جو کہ ملک میں معاشی خوش حالی' قومی بہبود' علم میں اضافے اور پھیلاؤ میں کردار ادا کرسکے۔ اس مقصد کو حاصل کرنے میں ریسرچ انوویشن اینڈ کمرشیلائزیشن آفیس کو سب سے اہم کردار دیا گیا ہے۔ یہ ادارے یونیورسٹیوں کے تحقیقی پروگرام اور کاروائیوں میں سوچے سمجھے عملی طریقہ کار کو لاگو کرنے میں مدد فراہم کریں گے اور یونیورسٹی کے لیے تحقیقی نتائج پر پہنچنے میں ان کا کلیدی کردار ہوگا۔ آفس آف ریسرچ، انوویشن اینڈ کمرشلائزیشن کے ۸ بنیادی مقاصد میں سے کچھ مندرجہ ذیل ہیں:

* یونیورسٹی کی تحقیق کو اسٹریٹیجک یعنی سوچے سمجھے راستوں اور پالیسی سازی پر ہموار کرنا۔
* تحقیق اور تدریس کے عمل کو آپس میں ملاتے ہوئے یونیورسٹی کی تمام سطحوں پر بہتر کرنا۔
* کاروبار اور یونیورسٹی کے درمیان بہتر مراسم پیدا کرنا۔
* مقامی اور قومی معیشت کو بہتر بنانے کے لیے کاروبار چلانے والوں (entrepreneurs)، ٹیکنالوجی ٹرانسفر اور کاروباری کاروائیوں کی ہمت افزائی کرنا۔

اوپر دیے گئے مقاصد کھل کر یہ واضح نہیں کرتے کہ اب تحقیق اور تحقیق کے عمل سے حاصل کی

جانے والی ٹیکنالوجی کس حد تک کاروباری مفاد کو سامنے رکھے گی۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ بہرحال اب یونیورسٹیوں میں تحقیقی ادارے یقیناً منافع خور اداروں کے ساتھ مل کر ہی آگے بڑھیں گے۔ کیونکہ ''آوٹ کم'' یعنی تحقیق کے نتیجہ میں حاصل کردہ علم کو کاروبار کے ذریعہ منڈی میں بیچنا فوقیت رکھتا ہے تو یقیناً اس میں منافع کمانے کے اصولوں کو ہی اولیت دی جائے گی۔

پاکستان میں نیولبرل یا آزاد تجارت کے اصولوں کو بڑھ چڑھ کر فروغ دیا جارہا ہے لہذا یہی اصول ہماری تعلیم اور تحقیقی اداروں میں بھی رائج کیے جارہے ہیں۔ بی ٹی کپاس اور جینیاتی اشیا پر تحقیق اس کی ایک زندہ مثال ہے۔ فیصل آباد زرعی یونیورسٹی میں قائم کردہ دفتر برائے ریسرچ انویشن اینڈ کمرشلائزیشن میں جینیاتی فصلوں اور خاص طور پر بی ٹی کپاس کے لیے کافی حمایت دیکھی گئی۔ اس ادارے کا خیال ہے کہ بی ٹی کپاس میں ''ایک جین کا ہی اضافہ ہے''۔ آج کی سرمایہ داری سائنس میں اس طرح کے خیالات reductionism (یعنی ایک گھمبیر مسئلے کو بالکل چھوٹے دائرے کار میں دیکھنا) کی بہترین مثال ہے۔ مونسانٹو کی بی ٹی کپاس کے بارے میں ایک طرف تحفظات پیش کیے جارہے ہیں اور دوسری طرف پاکستانی بی ٹی کپاس کو ایک بہتر حل کے طور پر پیش کیا جارہا ہے۔ اگر یہ فرض بھی کرلیا جائے کہ اس سے واقعی کوئی حرج یا نقصان نہیں ہے تو ہم پھر بھی جینیاتی اشیا و زندہ اقسام کی پیداوار کو اتنے سہل انداز میں فطرت میں داخل نہیں کرسکتے۔ لیکن سائنس داں جو کہ سرمایہ داری نظام سے جڑ کر اپنے علم حاصل کرنے کے بنیادی اصولوں کو بھول چکے ہیں، اس قدر بڑے مسئلے کو نظر انداز کیے جارہے ہیں۔

پاکستان اور ہندوستان کی حکومتیں مقامی کمپنیوں اور کاروبار کو تحفظ دے رہی ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ قومی کمپنیوں کا فروغ ملک کی معاشی حالت کو مستحکم کرنے میں مدد دیتا ہے اور یہ ایک بہتر قدم ہے۔ لیکن عوام دوست سوچ قوم پرستی پر نہیں رک سکتی۔ کیا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ غیر ملکی سرمایہ کاروں کو زمین نہ دی جائے لیکن ملک میں جاگیرداری رائج رکھنے میں کوئی نقصان نہیں ہے؟ پاکستان کے ۷۰ فیصد عوام دیہات میں رہتے ہیں اور ان میں سے کثیر تعداد جاگیرداری کے ظلم تلے بے حال ہے۔ تو کیا یہ صحیح ہے کہ ہم غیر ملکی زرعی کمپنیوں کے ظلم اور استحصال کے خلاف تو آواز اٹھائیں لیکن اس طرح کی فصلوں پر جن کی کاشت سے مقامی کمپنیوں اور بڑے جاگیرداروں کو فائدہ ہو اور چھوٹے، بے زمین کسانوں کے لیے نقصان، پر کوئی آواز نہ اٹھائی جائے؟ جینیاتی اشیا اور جینیاتی سائنس چاہے غیر ملکی درس گاہوں اور زرعی کمپنیوں کے ذریعہ ہمارے ملک میں پیش کیا جائے یا مقامی یونیورسٹیوں اور کمپنیوں کے ذریعہ اس سائنس کی بنیادی کمزوریاں اور نتائج دونوں حالت میں ایک ہیں اور ہم کو دونوں حالات میں جینیاتی بیج اور اشیا کو اپنی دھرتی پر قبول نہیں کرنا چاہیے۔

اگر انسان دوست اور کسان دوست سائنسی تحقیق کی بنیاد پر ایسی ایجادات سامنے آتی ہیں جو کہ عوام کی معاشی ترقی کو فروغ دیتے ہوئے ماحول دوست بھی ہوں اور طبقاتی تفریق کو بھی توڑتی ہوں تو ایسی سائنس کو قبول کرنے میں کوئی عار نہیں۔ یہ ایک دفعہ پھر سے لکھنا ضروری ہے کہ ٹیکنالوجی بے جان ہوتی ہے۔ اس کے پیچھے سیاسی سوچ، معاشی، ماحولیاتی اور سماجی نتائج اہم ہوتے ہیں۔ تاہم ایسی سائنس اور ٹیکنالوجی کو قبول کرنے میں کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہیے جو معاشرے میں سماجی، معاشی اور ماحولیاتی بہتری پیش کرے اور ساتھ ساتھ منافع خوری کی نفی کرے۔

## حوالہ جات


1. *Pakistan Statistical Yearbook 1997-98.*

2. (http://www.pakissan.com/english/advisory/biotechnology/living.without.bio.safety.laws.shtml) accessed on May 25, 2012.

3. Wilhelm Peekhaus, "The Neoliberal University and Agricultural Biotechnology: Reports from the Field" in *The Bulletin of Science, Technology and Society* 30 (6), 2010, p 418. http://bst.sagapub.com/content/30/6/415.refs.html

4. *Ibid.*

5. Raahia Ahsan, Zafar Altaf, "Development, Adoption and Performance of Bt Cotton in Pakistan: A Review", *Pakistan Journal of Agricultural Research*, Vol 22, No, 1-2, 2010.

6. Ashfaq Bukhari, "Punjab government shuns Bt. Cotton", January 23, 2012 accessed from http://dawn.com/2012/01/23/punjab-government-shuns-bt-cotton/on May 28, 2012.

7. Ashfak Bokhari, "Puzzling field trial of Bt corn", Daily *Dawn*, 2 April, 2012, p VI.

8. Mae-Wan Ho, *Genetic Engineering Dreams or Nighmares? the Brave New World of Bad Science and Big Business*, Research Foundation for Science, Technology and Ecology & Third World Network. 1997.

9. Wilhelm Peekhaus, *op.cit.*,

10. Jack Ralph Kloppenburg Jr., *First the Seed: the Political Economy of Plant Biotechnology, 1492-2000*, Second Edition. The University of Wisconsin Press, 2004, p. 108.

11. *Ibid.*, p. 231.

12. Wilhelm Piekhous, *op.cit.*, p. 417.

13. http://www.hec.gov.pk/insidehec/divisions/rnd/ori/Pages/OfficeforResearchInnovation(ORI).aspx

# پائیدار زراعت: ذہنی غلامی کی اسیری میں

تحریر: نوید اقبال

طبقاتی کشمکش کی انسانی تاریخ میں نوآبادیاتی نظام کا باب ایک ایسا موڑ ہے جس نے اس کرۂ ارض پر خطوں کے مابین طاقت کے توازن میں ایسے عدم استحکام کو جنم دیا جس کی دلدل میں ہم آج تک پھنسے ہوئے ہیں۔ مغربی یورپی ممالک نے جب ایشیا، افریقہ اور لاطینی امریکہ پر اپنا نوآبادیاتی نظام مسلط کیا تو ایک طرف یہاں پر آباد لوگوں کا معاشی استحصال شروع ہوا تو دوسری طرف خام مال کا ایک بہت بڑا حصہ مغرب کی منڈیوں میں منتقل ہونے لگا جس سے پھر یورپ میں صنعتی انقلاب کی راہ ہموار ہوئی۔

برصغیر کی سرزمین پر زراعت کی روایت صدیوں پرانی ہے۔ سات ہزار سال پہلے وادی سندھ کی تہذیب میں موئنجودڑو کے مقام پر دریافت ہونے والے آثار اسی طرف ایک اشارہ ہیں۔ اس سے ہم یہ نتیجہ باآسانی اخذ کر سکتے ہیں کہ یہاں کے مقامی لوگوں نے نظام فطرت کو سمجھتے ہوئے پائیدار بنیادوں پر زراعت کو اپنی زندگیوں سے جوڑا اور پھر بعد کے آنے والے ادوار میں اس زراعت کی بنیاد پر دوسرے شعبہ ہائے روزگار کو رواج دیا۔ اس طرح ہر گاؤں وقت کے ساتھ ساتھ زراعت سے لے کر صنعت تک، معاشی اکائی کے طور پر اس خطے کی خوشحالی میں اپنا کردار ادا کرنے لگا۔ اس معیشت کی بنیاد نسل در نسل ترقی پاتے ہوئے اس علم پر تھی جو خود انحصاری کے ساتھ ساتھ ماحول دوست بھی تھا۔

## معاشی غلامی اور ذہنی اسیری: تاریخی پس منظر

گو کہ سترھویں صدی میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے مغل بادشاہ جہانگیر سے ہند کی سرزمین پر تجارت کرنے کا اجازت نامہ حاصل کر لیا تھا لیکن ۱۷۵۷ء میں جنگ پلاسی کی فتح کے بعد کمپنی نے صحیح معنوں میں یہاں پر اپنے قدم جمائے۔ اس طرح بنگال پر قبضے کے بعد ان کا یہاں پر اثر و رسوخ بڑھتا چلا گیا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی نے زراعت کے شعبے میں یورپ کی منڈیوں کی طلب کو مدنظر رکھتے ہوئے نئی نقد آور فصلوں کو متعارف کروایا۔ مثال کے طور پر چائے، انڈیگو وغیرہ۔ زراعت کے شعبے میں اس ابتدائی مداخلت نے ہمارے معاشرتی تانے بانے میں ایسے ارتعاش کو جنم دیا جس سے کئی ایک مقامی صنعتیں متاثر ہونا شروع ہوئیں۔ بنگال کی ٹیکسٹائل صنعت کے متعلق جو دنیا بھر میں اپنی مثال آپ تھی، وندانہ شیوا لکھتی ہیں کہ:

"The thumbs of the best Bengal weavers were cut off to cut off market competition when Indian hand woven textiles continued to do better than the British mill products".

(بنگال میں بہترین کپڑا بننے والوں کے انگوٹھے اس لیے کاٹ دیے گئے تا کہ برطانیہ کی فیکٹریوں میں بننے والا صنعتی کپڑا انڈیا میں ہاتھ سے بنے ہوئے عمدہ کپڑے کا آسانی سے مقابلہ کر سکے۔)[۱]

جب برطانوی راج نے یہاں پر فری ٹریڈ یعنی آزاد تجارت کی پالیسی اپنائی تو دونوں ممالک کے درمیان طاقت کے عدم توازن کی وجہ سے یہاں کی رہی سہی صنعت بھی دم توڑنے لگی۔ مغرب کی کم قیمت صنعتی مصنوعات کی ملک میں بڑھتی ہوئی درآمدات اور وہاں پر قائم صنعتوں کے لیے خام مال کی بڑھتی ہوئی برآمدات نے یہاں پر صدیوں سے مستحکم معیشت کی بنیادوں کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔

انڈیا کی بیرونی تجارت[۲] (کروڑ روپے)

| | درآمدات | برآمدات |
|---|---|---|
| ۱۸۴۱ | ۱۰ | ۱۴ |
| ۱۸۶۰ | ۲۳ | ۳۳ |
| ۱۸۸۰ | ۵۰ | ۷۴ |
| ۱۹۰۰ | ۸۱ | ۱۰۸ |
| ۱۹۱۳ | ۱۹۱ | ۲۴۹ |

برآمدات کی بڑھتی ہوئی شرح کے کھوکھلے پن کو سمجھنے کے لیے یہ کہا جاتا ہے کہ:

"If the history of British Rule in India were to be condensed into a single fact it is this, there was no increase in India's per capita income from 1757 to 1947".

(اگر انڈیا میں برطانوی راج کی تاریخ کو صرف ایک حقیقت میں بند کر کے پیش کیا جائے تو وہ یہ ہے کہ انڈیا میں ۱۷۵۷ء سے لے کر ۱۹۴۷ء تک فی کس آمدنی میں کوئی اضافہ نہیں ہوا۔)[۳]

اس معاشی ابتری میں انگریزوں کے متعارف کردہ زرعی زمین کی نجی ملکیت کے قانون نے جہاں ہمیں اجتماعی طرز زندگی سے دور کیا وہیں طبقاتی تقسیم کی بنیادوں کو مزید گہرا کر دیا۔ اس کے بعد ہم بیرونی ظلم کے خلاف صف آرا ہونے کی بجائے اندرونی کشمکش میں محو ہوتے چلے گئے۔

اس حقیقت سے کسی کو انکار نہیں کہ مغرب کے صنعتی انقلاب کے آغاز میں جدید سرمایہ دارانہ سائنس نے بہت بڑا کردار ادا کیا لیکن یہاں یہ سمجھنا بھی ضروری ہے کہ سامراجیت کے قائم کرنے میں سائنس کا خدمت انسانی کا دعویٰ وقت کے ساتھ ایک ایسے آلہ کار کی صورت اختیار کر گیا جس نے ان نوآبادیات میں ظلم کی ایک ہولناک تاریخ رقم کی۔ مثال کے طور پر بھاپ سے چلنے والا ریلوے انجن، ٹیلیگراف مشین وغیرہ۔ اس سامراجی طاقت کے آگے ہر چیز انہی کی صنعت کا پرزہ بننے لگی۔ نتیجتاً سماجی ناانصافی اور معاشی ابتری نے انگریز سرکار کے لیے وہ مقامی اشرافیہ کا طبقہ بھی پیدا کر دیا جس کے

وہ خواہاں تھے۔ یعنی کہ ایک ایسا طبقہ جو ان کے اور لاکھوں عوام کے درمیان جن پر وہ حکمرانی کرتے تھے رابطے کا ذریعہ بنے۔ ایک ایسا طبقہ جس کا خون اور رنگ تو انڈین ہو لیکن ذوق، رائے، اقدار اور ذہانت انگریزی کی سی ہو۔[۴]

سماج کے اندر اس وقت تک زیادہ تر تقسیم معاشی بنیادوں پر کی گئی تھی۔ مذہبی بنیادوں پر تقسیم کی مربوط کوشش ۱۸۷۱ء میں چارلس ایلیٹ کی آٹھ جلدوں پر مشتمل Historian's History of India کی صورت میں سامنے آئی جس کی کڑیاں پھر دو قومی نظریے سے بھی جا ملتی ہیں۔ اس تحریر میں تیرہویں صدی سے لے کر بیسویں صدی تک لکھی جانے والی مسلم تاریخ کا فارسی سے انگریزی میں ترجمہ کیا گیا ہے۔ اس تحریر کے پوشیدہ مقاصد وقت کے ساتھ آہستہ آہستہ ظاہر ہوتے گئے کیونکہ خطے میں جب فارسی کی جگہ انگریزی اور اردو کو رواج دیا گیا تو ہمارے لیے یہ ممکن نہ رہا کہ ہم بنیادی ماخذ (primary source) کو کھنگالیں۔ اس لیے بعد کی بیشتر تحقیق اسی کتاب کو بنیادی ماخذ سمجھتے ہوئے لکھی گئی۔ اس سے مصنف کے ذاتی عناد کا رنگ اس کے بعد کی ہر تحقیق میں گہرا ہوتا چلا گیا۔

دوسری جنگ عظیم کے بعد جب انگریز سرکار کے لیے ان نوآبادیات کو چلانا مشکل ہو گیا تو اس نے اس خطے کو "پرامن" بنیادوں پر تقسیم کرتے ہوئے اقتدار کی منتقلی (Transfer of Power) کا اہتمام کیا ہے۔ طاقت کی اس منتقلی کو ہمیں تیسری دنیا کے تناظر میں دیکھنے اور سمجھنے کی ضرورت ہے۔

## نوآبادیاتی نظام کا دوسرا باب: سبز انقلاب اور سامراجی بیج

''امن کے نوبل انعام یافتہ'' نورمن بورلاگ نے ۱۹۴۰ کی دہائی میں جدید زراعت کے حوالے سے چھوٹے قد کی گندم، چاول اور مکئی وغیرہ کی نئی اقسام متعارف کرائیں۔ جنہیں عام طور پر High Yielding Varieties (HYVs) یعنی زیادہ پیداوار دینے والی اقسام کہا جاتا ہے۔ ایسی اقسام میں پودوں کا قد چھوٹا اور جھاڑ کم ہوتا ہے اور ایسے پودوں کی جڑیں زمین میں زیادہ گہرائی تک نہیں جاتیں۔ نتیجتاً زمین کی تہہ کے اندر گہرائی سے نمکیات اور دیگر غذا کا جذب کرنا اس کے لیے ناممکن ہے۔ اس لیے ایسی اقسام سے زیادہ پیداوار کے حصول کے لیے کیمیائی کھادوں اور زیادہ پانی کا استعمال ضرورت بنتا چلا گیا۔ حقیقت میں انہیں High Yielding Varieties کے بجائے High Responsive Varieties کہنا زیادہ مناسب ہوگا کیونکہ ان کے اندر مصنوعی کیمیائی کھادوں کو جذب کرنے کی زیادہ صلاحیت ہوتی ہے۔

سبز انقلاب کی ٹیکنالوجی دراصل سرخ انقلاب کا راستہ روکنے کے لیے مغربی سرمایہ دار طاقتوں کا ایک ایسا ہتھیار تھا جو اس نے تیسری دنیا کے ممالک پر اپنا تسلط قائم رکھنے کے لیے استعمال کیا' لیکن اسے دنیا کی بڑھتی ہوئی آبادی جو کہ زیادہ تر تیسری دنیا میں مقیم تھی کی غذائی ضروریات کو پورا کرنے اور عالمی بھوک مٹانے کے حوالے سے پیش کیا گیا۔ ہندوستان میں بھوک و افلاس کی وجوہات کو نوآبادیاتی نظام سے جوڑتے ہوئے جواہر لال نہرو کہتے ہیں:

"By independence, hunger and mass poverty were worst in the parts of India that British had governed the longest. Bengal the richest part of India during Mughal times, had become one of the poorest after nearly 300 years of British rule".

(آزادی کے وقت' بھوک اور غربت کی حالت انڈیا کے ان علاقوں میں سب سے بدتر تھی جن میں برطانوی راج سب سے لمبے عرصے تک رہا۔ بنگال جو کہ مغلوں کے عہد حکمرانی میں سب سے امیر ترین حصہ تھا' برطانوی راج کے تین سو سالہ دور حکمرانی میں سب سے پسماندہ حصہ بن گیا)۔[۶]

سبز انقلاب جسے زراعت میں نوآبادیاتی نظام کا دوسرا باب کہہ سکتے ہیں، اس نئے بیج جن کو "معجزاتی بیج" بھی کہتے ہیں کو پاکستان میں ۶۰ کی دہائی میں جنرل ایوب خان کے دور میں متعارف کروایا گیا، اس بیج کے علاوہ اور نئی ٹیکنالوجیز بھی متعارف کروائی گئی مثلاً ٹریکٹر، ٹیوب ویل وغیرہ۔ چونکہ یہ بیج زیادہ پانی میں ہی بہتر پیداوار دیتے تھے اس لیے ایسی اقسام کی کاشت پر پانی کی بڑھتی ہوئی ضروریات کی وجہ سے حالات کشیدہ ہونا شروع ہوئے۔ یہ کشیدگی نا صرف ہمسایہ ملک ہندوستان بلکہ صوبوں، ضلعوں، تحصیلوں اور گاؤں ہر سطح پر نظر آنے لگی۔ اسی ٹیکنالوجی کے مرہون منت ڈیموں اور بیراجوں کے حوالے سے بھی نئی سیاست کا آغاز ہوا۔ اس کے علاوہ وقت کے ساتھ ساتھ پانی کی بڑھتی ہوئی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے ٹیوب ویل کے استعمال میں بھی اضافہ ہوا جس سے زیر زمین پانی کے قدیم ذخائر پر دباؤ بڑھتا چلا گیا۔

زیادہ سے زیادہ پیداوار کے حصول کے لیے کیمیائی کھادوں کے استعمال کی حوصلہ افزائی حکومتی سطح پر کی گئی۔ کھیتوں میں اس زہریلے زرعی مواد کے استعمال سے زراعت کے شعبے نے ماحولیاتی توازن میں جو بگاڑ پیدا کرنا شروع کیا اس کے اثرات آہستہ آہستہ تینوں درجوں یعنی زمین، آب اور فضا ہر جگہ ظاہر ہونے لگے۔ نتیجتاً غذائی جال متاثر ہونا شروع ہوا اور شکار اور شکاری (prey and predator relationship) کا ماحول میں موجود قدرتی توازن کے بگڑنے سے فصل میں پیدا ہونے والی بیماریوں کی شرح بڑھتی چلی گئی۔ اس طرح کیڑے اور سنڈیوں سے فصل کو لاحق نقصان کے پیش نظر مغربی سرمایہ دار طاقتوں نے کیڑے مار زہر یعنی پیسٹی سائیڈ اسپرے متعارف کروائی۔ زراعت کو درپیش ان نئے چیلنجز سے نمٹنے کے لیے شہروں میں کیمیائی کھاد، کیڑے مار ادویات اور دوسری متعلقہ ضروریات کے حوالے سے صنعت کا قیام عمل میں آنا شروع ہوا۔ اس طرح ایک طرف شہروں میں ہونے والی صنعتی ترقی کی وجہ سے روزگار کے نئے مواقع پیدا ہوئے جو مزدوروں کے استحصال کی ایک اور کڑی ہے، تو دوسری طرف صنعتی زراعت کے فروغ سے بے زمین کسانوں کی اکثریت بے روزگار ہونے لگی۔ ان حالات کی وجہ سے شہروں میں منتقلی کا رجحان بھی بڑھتا رہا۔

ہمیں یہ بھی سمجھنا چاہیے کہ سبز انقلاب کے معجزاتی بیج کی وجہ سے جو زرعی پیداوار میں اضافہ ہوا اس کا زیادہ تر فائدہ بڑے زمینداروں کے حصے میں آیا۔ چھوٹے کسان اس بیج کے لوازم یعنی کھاد، کیمیائی اسپرے اور زیادہ پانی پورا کرنے کے چکر میں ایک طرف قرضے میں ڈوبتے گئے تو دوسری طرف ان کیمیائی مواد کے بڑھتے ہوئے استعمال کے سبب ان کی

صحت بھی بری طرح متاثر ہونے لگی۔ اس کے علاوہ وقت کے ساتھ ساتھ ان کیمیکلز کی وجہ سے زمین کی قدرتی زرخیزی بھی تباہ ہوتی گئی۔ مختصراً اس سبز انقلاب سے طبقاتی تفریق مزید گہری ہوئی۔

ان شہروں میں جہاں ایک طرف دیہاتوں میں ہونے والی زرعی پیداوار کا ایک بڑا حصہ منتقل ہونے لگا وہیں پر دوسری بنیادی ضروریات کی فراہمی کے لیے انفرااسٹرکچر کی تعمیر کا کام شروع ہوا۔ جس سے ایک بار پھر روزگار کے بے شمار مواقع استحصال کی نئی شکلوں کے ساتھ پیدا ہوئے۔ مثال کے طور پر سڑکیں، بنیادی صحت کے مراکز، اسکول اور بینکس وغیرہ۔ نتیجتاً ''ترقی'' کا پہیہ تیز تیز گھومنے لگا اور چھوٹی آبادیاں کچھ ہی سالوں میں بڑے بڑے شہروں کا روپ دھارنے لگیں۔ ''ترقی'' کی اس چہل پہل میں جہاں تعمیراتی کام کے حوالے سے جنگلات کے کٹنے کے عمل میں تیزی آتی گئی وہیں تیل کے استعمال میں بھی تیزی سے اضافہ ہوا۔ تیل نا صرف گاڑیوں میں جلتا ہے بلکہ شہروں میں قائم صنعتوں میں بطور ایندھن بھی استعمال ہوتا ہے۔ اس طرح دیہاتوں سے لے کر شہروں اور شہروں میں قائم صنعتوں، ہر جگہ اس ''ترقی'' کا تمام تر دارو مدار تیل پر ہو گیا۔

جب مغربی سامراجی قوتوں نے ہم جیسے ممالک پر اپنی آزاد تجارت کی پالیسیوں کو لاگو کیا تو ملک میں روزمرہ استعمال کی چیزوں کی درآمدات بڑھنے لگیں۔ یعنی وہ چیزیں جو ہم خود بناتے تھے اب درآمد بھی کرنے لگے۔ اس وجہ سے ہماری مقامی صنعت تباہی سے دوچار ہونے لگی جس کا تلخ تجربہ ہم انگریز کے نوآبادیاتی نظام میں کر چکے تھے۔ اس طرح نا صرف ہمارے بلکہ تیسری دنیا کے اکثر شہر روزمرہ کے استعمال کی مغربی صنعتی مصنوعات کے صارف (consumer hub) بنتے چلے گئے۔ اس طرح ان کنزیومر اشیا کے بے تحاشہ استعمال سے پیدا ہونے والا کچرا ایک طرف ماحولیاتی آلودگی کا پیش خیمہ بنا تو دوسری طرف جنگلات کے بے دریغ کٹنے، صنعتوں، ذرائع آمدورفت اور کارپوریٹ زراعت میں تیل کے بڑھتے ہوئے استعمال کی وجہ سے خارج ہونے والی گرین ہاؤس گیسوں کی فضا میں مقدار بڑھتی گئی جس سے گلوبل وارمنگ (زمینی درجہ حرارت کا بڑھنا) جیسے مسائل ہمارے سامنے آنے لگے۔

پاکستان میں ۲۰۱۰ء کے سیلاب اور ۲۰۱۱ء میں سندھ میں ہونے والی سیلابی بارشیں چند ایسے حقائق ہیں جو ہمیں اس ماحولیاتی بحران کی سنگینی سے براہ راست جوڑتے ہیں۔ اس صدی میں گلوبل وارمنگ دنیا کے سامنے ایک بڑے چیلنج کے طور پر سامنے آئی ہے جس نے سرمایہ دارانہ نظام کی نام نہاد ترقی کے غبارے سے ہوا نکال کر رکھ دی ہے۔

خاکہ نمبر ۱

## اگیری ایکسپو ۲۰۱۲ء

اس ماحولیاتی بحران کے باوجود سرمایہ داری نظام کو فروغ دینے کے لیے زرعی شعبے کو عالمی منڈی کے لیے سجایا جارہا ہے۔ اس سلسلے میں کراچی میں اگیری ایکسپو کے نام سے ایک نمائش ۱۱ سے ۱۲ فروری، ۲۰۱۲ منعقد ہوئی جس میں ملکی اور غیر ملکی سرمایہ کار کمپنیوں نے زراعت اور لائیو اسٹاک کے حوالے سے کئی اسٹال سجائے ہوئے تھے۔ اس نمائش کے ذریعے جیسا کہ اشتہار سے واضح ہے (خاکہ نمبر۱) میں زراعت کے ساتھ ساتھ ڈیری، ماہی پروری، پھولوں کی کاشت، لائیو اسٹاک (مال مویشی) اور پولٹری کے شعبہ جات میں مقامی اور بین الاقوامی سرمایہ کاری کے امکان کو واضح کیا گیا۔ ساتھ ساتھ تجارت کے حوالے سے ویلیو ایڈیشن (کسی بھی خام مال رشے میں ایسی تبدیلی جس سے منڈی میں اس کی قیمت بڑھ جائے/منافع کمانے کی شرح میں اضافہ ہو)، فوڈ ٹریسیبلیٹی (ایسا طریقہ کار جس میں کھیت میں خوراک اگانے سے لے کر دسترخوان تک پہنچانے کے عمل کی نگرانی کی جا سکے)، خوراک کے معیار کو بہتر بنانا، بایوٹیکنالوجی، کولڈ چین (مخصوص درجہ حرارت کو برقرار رکھتے ہوئے چیزوں کی نقل و حمل کا طریقہ کار تاکہ وہ گلنے سڑنے کے عمل سے بچ سکیں) اور اس سے متعلقہ انتظامات کے بہتر بنانے پر زور دیا گیا۔ ہمیں یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ اس خطے کے خام مال اور زرعی پیداوار کی کمپنیوں تک رسائی سے ایک بار پھر وہی اثرات مرتب ہوں گے جنہیں ہم نوآبادیاتی نظام میں بھگت چکے ہیں' جو کہیں جاگیرداری کی صورت میں ہم پر عیاں ہیں تو کہیں بھوک اور افلاس جیسی بھیانک حقیقتوں کی شکل میں۔

پچھلے صفحے پر چھپا ہوا اشتہار جو کراچی میں منعقد کی جانے والی اگیری ایکسپو ۲۰۱۲ء کے لیے استعمال کیا گیا کے دائیں حصے میں ان key players (بنیادی کھلاڑیوں) کے logos (پہچان کے نشان) موجود ہیں جو سرمایہ دارانہ نظام کے اندر زراعت اور لائیو اسٹاک کے شعبوں میں سرمایہ کاری کے فروغ کی کوشش میں ہیں مثال کے طور پر امریکی امداد دینے والا ادارہ یو ایس ایڈ (USAID)، امریکی محکمہ برائے زراعت USDA، حکومت آسٹریلیا' کمیشن برائے آسٹریلین تجارت، یورپی یونین، پاکستان آسٹریلیا بزنس فورم، اینگرو گروپ، فاطمہ گروپ کے ساتھ ساتھ اقوام متحدہ کا خوراک و زراعت کا ادارہ ایف اے او، یو این آئی ڈی او، حکومت پاکستان کے تجارت کے حوالے سے ادارے مثلاً منسٹری آف کامرس، فیڈریشن آف پاکستان چیمبر آف کامرس اینڈ انڈسٹری، حکومت پنجاب اور پنجاب بورڈ آف انویسٹمنٹ اینڈ ٹریڈ زیادہ نمایاں پلیئرز کے طور پر سامنے آئے ہیں۔ اگر ہم ان اداروں اور گروہ کو ذرا غور سے دیکھیں تو یہ بات بالکل واضح ہے کہ ان تمام تر گروہوں کا اس زراعت سے براہ راست کوئی تعلق نہیں جس سے ہمارے کسان، مزدور اور ماحول وابستہ ہیں لیکن اس سے جڑے سرمائے سے ضرور ہے جو ہمارے کسانوں اور مزدوروں کے خون پسینے سے پیدا ہوتا ہے۔ زراعت اور لائیو اسٹاک کے شعبے میں یہ طرز عمل اسی آزاد تجارت کے ایجنڈے کا عکس ہے جس کو ہم نا صرف مندرجہ ذیل بیانات کے تناظر میں سمجھ سکتے ہیں بلکہ نوآبادیاتی نظام کے تحت برطانوی راج کی آزاد تجارت کی پالیسیوں سے بھی جوڑ سکتے ہیں۔

امریکی سفیر کیمرون منٹر نے کہا کہ:

''امریکا یہ چاہتا ہے کہ پاکستان معاشی طور پر مستحکم ہو اور اس سلسلے میں وہ اپنے کاروباری شعبے اور پاکستانی کاروباری شعبے اور امریکی اور پاکستانی عوام کے درمیان باہمی تعلقات کی مضبوطی چاہتا ہے اور اس لیے زرعی پیداوار کی بیرونی منڈیوں تک بہتر رسائی کے لیے تکنیکی مدد فراہم کر رہا ہے''۔ ۸

حکومت پاکستان کے وفاقی سیکریٹری کامرس ظفر محمود نے زرعی شعبے میں قدر بڑھانے کی ضرورت اور اس کے لیے زیادہ سرمایہ کاری اور ٹیکنالوجی فراہم کرنے پر زور دیتے ہوئے کہا کہ:

''زرعی شعبے کے لیے زیادہ سے زیادہ فوائد حاصل کرنے کے حوالے سے حکومت کو زرعی تحقیق اور بیج تیار کرنے کے پروگرام کی یا تو نجکاری کر دینی چاہیے یا ان کو بیرونی ذرائع استعمال کرتے ہوئے تکمیل تک پہنچانا چاہیے''۔ ۹

دونوں حکومتوں کی طرف سے آنے والے اگر صرف ان بیانات کا ہی تجزیہ کیا جائے تو یہ بات بالکل واضح ہے کہ حکومتی سطح پر زراعت اور لائیو اسٹاک کے حوالے سے نا صرف جدید ٹیکنالوجی کو خوش آمدید کہا جا رہا ہے بلکہ نجی شراکت داری کی بھی حوصلہ افزائی کی جارہی ہے۔ جس کا مطلب یہ ہوگا کہ فیصلہ سازی میں حکومتی کردار آہستہ آہستہ ختم ہوتا جائے گا اور نتیجتاً نجی شعبہ کی تمام تر فیصلہ سازی اپنے منافع کو تحفظ دینے اور بڑھانے کے حوالے سے ترتیب پائے گی۔

## گرین اکانومی اور ذہنی ملکیت

سامراجی قوتیں اپنی گرتی ہوئی معیشت کو سہارا دینے اور اپنی طاقت کو قائم رکھنے کے لیے اب پوری دنیا میں ایک نئی پالیسی متعارف کروا رہی ہیں جسے گرین اکانومی (سبز معیشت) کا نام دیا جارہا ہے۔ جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ گلوبل وارمنگ (زمینی درجہ حرارت کا بڑھنا) جیسی حقیقت نے اس نظام کی بنیادوں کو ہلا کر رکھ دیا تو اس کے جواب میں کاربن کے اخراج کو کم کرنے پر زور دیا جارہا ہے۔ اس سلسلے میں توانائی کے حوالے سے نئی ٹیکنالوجیز مثلاً سولر انرجی (سورج سے حاصل کردہ توانائی)، ونڈ انرجی (ہوا سے حاصل کردہ توانائی)، ہائیڈل انرجی (پانی سے حاصل کردہ توانائی) کو متعارف کروانے کے ساتھ ساتھ تیل کے زیرِ زمین کم ہوتے ہوئے ذخائر کے پیش نظر ایگرو فیول (فصلوں سے تیل پیدا کرنا) کو بھی فروغ دیا جارہا ہے۔ زراعت کا چونکہ زیادہ تر انحصار موسم پر ہوتا ہے اس لیے ماحولیاتی تبدیلیوں کے جواب میں بھی جینیاتی فصلوں کو متعارف کروایا جارہا ہے۔ مثلاً خشک سالی کے خلاف مزاحمت رکھنے والی اقسام وغیرہ۔ مزید یہ کہ قدرتی وسائل یعنی پانی، جنگلات، ماہی پروری کے علاوہ ٹرانسپورٹ، عمارتوں اور شہروں کے شعبوں میں بھی اسی ''سبز سوچ'' کو متعارف کرانے کی کوشش کی جارہی ہے۔ مختصراً یہ کہ موجودہ نظام کے مسائل کے ٹیکنیکل حل کے حوالے سے گرین اکانومی کے نئے ماڈل کو پائیدار ترقی اور غربت کے خاتمے جیسے دو بڑے نعروں کے ساتھ پیش کیا جارہا ہے۔

اگر چہ اگیری ایکسپو نمائش میں کئی شعبہ جات میں سرمایہ کاری کے مواقعوں کو پیش

کیا گیا تاہم اگر ہم اس کو نئے آنے والے فریم ورک یعنی گرین اکانومی سے بھی جوڑ کر سمجھیں جس کا غالب اندیشہ ہے تو آئی پی آر یعنی ذہنی ملکیت کی شق کو گرین اکانومی کے اندر بھی صرف اسی سرمائے کے تحفظ کے لیے پیش کیا جا رہا ہے جو کہ براہ راست نجی شعبہ سے جڑا ہوا ہے۔ حالانکہ گرین اکانومی کا ماڈل پائیدار ترقی اور غربت کے خاتمے کے طور پر پیش کیا جا رہا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ ذہنی ملکیت کے معاہدے اور نجی شعبہ کو تحفظ دینا بذات خود ان دعوؤں کی نفی ہے جو گرین اکانومی میں کیے جا رہے ہیں۔ جینیاتی بیج اس کی ایک واضح مثال ہے جس کی تیاری میں نجی شعبہ نے ایک طرف اس کرہ ارض پر پائی جانے والی تمام تر حیات کو بطور خام مال استعمال کیا تو دوسری طرف کسانوں کی اس اجتماعی دولت پر ڈاکہ ڈالا جو کہ صدیوں کے ارتقائی عمل کے بعد ہم تک پہنچی تھی اور پھر اس خام مال کو استعمال کرتے ہوئے جینیاتی انجینئرنگ کے ذریعے نئے بیج بنائے گئے جنہیں آئی پی آر یعنی ذہنی ملکیت کے حقوق کے تحت تحفظ دیا گیا۔ یہاں اس بحث کو آپ کے سامنے لانا اس لیے ضروری ہے کیونکہ نمائش میں مونسانٹو کا اسٹال موجود تھا جو دنیا بھر میں بیج کی سب سے بڑی کمپنی ہے۔ یہ کمپنی نا صرف موجودہ مسائل سے نمٹنے کا ہمیں اپنی جینیاتی بیج بیچ کر ”حل“ بتاتی ہے بلکہ اپنے سرمائے کے تحفظ کے لیے اسی ذہنی ملکیت کی شق کو استعمال کرتی ہے۔

ان ٹیکنیکل جوابات کو اس طرح بھی سمجھا جا سکتا ہے کہ امریکن سنڈی کی روک تھام کے لیے بی ٹی کپاس، وٹامن اے کی کمی پوری کرنے کے لیے گولڈن رائس، گوشت کی ضرورت پوری کرنے کے لیے in vitro meat، ایندھن کی ضرورت کے حوالے سے ایگرو فیول اور موسمی تبدیلیوں کا مقابلہ کرنے کے لیے نئی جینیاتی اقسام، ان تمام تر ٹیکنیکل جوابات نے نظام فطرت میں پائے جانے والے افزائش نسل کے اصولوں کی نفی کی ہے جس کے نتیجے میں ارتقاء کے عمل کا وہ سلسلہ رک گیا ہے جو کہ صدیوں پر محیط تھا۔ دوسرا قابل فکر پہلو یہ ہے کہ ایسی جینیاتی فصلوں کی کاشت سے ہماری روایتی اقسام جینیاتی طور پر آلودہ ہو رہی ہیں اور ہم اپنی صدیوں پرانی دولت یعنی روایتی بیج سے بھی محروم ہوتے جا رہے ہیں۔ ہمیں یہاں یہ سمجھنا نہایت ضروری ہے کہ جینیاتی آلودگی ایک ایسا عمل ہے جس کو واپس پلٹنا کسی طور ممکن نہ ہوگا۔ مسائل کے ان تمام تر وقتی جوابات کا مقصد اپنے سرمائے کا فروغ ہے۔ مغربی قوتوں کی طرف سے پیش کردہ یہ تمام تر وقتی حل بے شمار نئے مسائل کو جنم دے رہے ہیں۔

## آرگینک فارمنگ

اس نمائش کے اندر پائیدار زراعت کی بجائے جدید زراعت اور آرگینک فارمنگ کے حوالے سے بھی اسٹالز تھے۔ جدید زراعت میں جہاں ایک طرف مشینری کو متعارف کروایا جا رہا تھا وہیں آرگینک فارمنگ کو کیمیائی کھادوں اور زرعی ادویات سے پاک اور صحت مند غذا کے طور پر مارکیٹ سے جوڑ کر پیش کیا جا رہا تھا۔ مثال کے طور پر آرگینک فارمنگ میں ۱۳ مائیکرو نیوٹرینٹس (غذائی اجزا) کا استعمال جس کا مطلب یہ ہوا کہ ہم نے زراعت کو کائناتی اکائی کا ایک جز سمجھنے کے بجائے الگ کر کے محض منافع کمانے اور تھیلا نے کا ایک ذریعہ سمجھ لیا ہے۔ در اصل پائیدار طریقہ زراعت تو ماحول سے ہم آہنگ ہو کر صحت مند اور غذائیت سے بھرپور غذا فراہم کرتا ہے،

جس میں ماحول کے تینوں درجوں میں پائی جانے والی حیات یعنی آبی، زمینی اور فضائی اپنا کردار ادا کرتی ہیں۔ ہمیں یہ سمجھنا چاہیے کہ کوئی بھی ایسا طریقہ زراعت جس کا مقصد پیداوار کی رفتار بڑھانا اور منافع کمانا ہو، پائیدار زراعت کے تمام تر اصولوں کی نفی کرتا ہے جو انسان دوست، ماحول دوست اور ارتقائی عمل کے اصولوں پر پروان چڑھے ہیں۔

خاکہ نمبر ۲

Source: AWETA: Sorting by weight, Burgemeester Winkellaan 3, 2631 HG Nootdorp (NL) a booklet distributed at the Agri Expo 2012, Karachi.

## خدشات اور تجاویز

اس طرح کی تجارتی نمائشوں سے جہاں مغربی سرمایہ دار قوتیں گرین اکانومی کے لیے میدان تیار کر رہی ہیں وہیں ہمارے ملکوں میں آ کر اپنی جدید ٹیکنالوجی کے فروغ کے علاوہ آرگینک فارمنگ کے حوالے سے مائیکرو نیوٹرینٹس کے ساتھ ساتھ کئی نئی مارکیٹیں کھولنا چاہ رہی ہیں۔ برآمدات کے حوالے سے کولڈ سپلائی چین، بین الاقوامی معیار کے مطابق پیکیجنگ (خاکہ نمبر ۲) اور برآمدی پروٹوکول یعنی قانونی نظم و ضبط کے مطابق عالمی منڈیوں میں ترسیل پر اصرار اور ان تمام تر شرائط کو پورا کرنے کے لیے مائیکرو فنانس یعنی سود کی بنیاد پر قرض کا جال، طاقت کے اسی عدم توازن کی عکاسی ہیں جس کی شروعات نوآبادیاتی نظام میں ہوئی تھی۔ اس نئی پالیسی سازی کا مقصد صرف یہ ہے کہ ہمارے کھیت ان کی صنعتوں کا پیٹ بھرنے کے لیے خام مال پیدا کریں اور ہمارے عوام ایک طرف انہی کے صنعتی سرمائے کو بڑھانے کے لیے بطور مزدور کام کریں تو دوسری طرف ان کی بنائی ہوئی اشیا کے استعمال کے لیے صارف بھی بنیں۔ ذہنی غلامی کی اس سے زیادہ تکلیف دہ حقیقت کیا ہوگی کہ مغربی قوتیں پاکستان آ کر ہمیں بتائیں کہ 'پائیدار طریقہ زراعت' کیا ہوتا ہے اور ہم' جن کی پائیدار زراعت کی اپنی روایت صدیوں پرانی ہے' من و عن ان کی تمام تر پالیسیوں پر لبیک کہیں۔

افسوس ہے کہ ان تمام مغربی پالیسیوں کو فروغ دینے کے عمل میں وہی مقامی اشرافیہ طبقہ سامنے آ رہا ہے جو انگریز دور میں پیدا کیا گیا تھا۔ یہ ہمارے لیے واقعتاً ایک بڑا لمحہ فکریہ ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام کی خامیاں اب کھل کر پوری دنیا پر واضح ہو چکی ہیں اور یہ نظام اپنی آخری سانس لے رہا ہے۔ معاشی ناانصافیوں کو دور کرنے کے بجائے مغربی دنیا اس وقت صرف اس غبار کو نکالنے کے لیے یہ نیا ڈھانچہ پیش کر رہی ہے جو اس نظام کے خلاف عوام میں ابل رہا ہے۔ ان غلامی کی زنجیروں کو توڑ کر ہمیں یعنی اس خطۂ ارض کے لوگوں کو بالخصوص جن کی سات ہزار سال پرانی تاریخ ہے اور تیسری دنیا کے لوگوں کو بالعموم حقیقی جمہوریت کی

بنیاد پر؛ جس میں تمام طبقات اور شعبہ ہائے زندگی کے لوگوں کی شمولیت ہو مل بیٹھ کر ایسی فیصلہ سازی کرنی چاہیے جو نا صرف پہلی دنیا اور تیسری دنیا کی تفریق کو ختم کر دے بلکہ ایک ایسی پائیدار ترقی جس میں پائیدار زراعت کو بنیادی حیثیت حاصل ہو کی تشریح کرے جو منافع کی بجائے طبقاتی تفریق کے خاتمے کے ساتھ انسان دوست اور ماحول دوست بنیادوں پر استوار ہو۔

## حوالہ جات


1. Vandana Shiva, *The Violence of the Green Revolution: Third World Agriculture, Ecology and Politics*, London, Zed Books Ltd; *Penang*, Malaysia, Third World Network, 1993, p. 236.

2. L.S. Stavrianos, *Global Rift, The Third World Comes of Age* New York, William Morrow and Company, INC, 1981, p. 250.

3. Mike Davis, *Late Victorian Holocaust: El Nino Famines and the Making of the Third World*, London, New York, Verso, 2001, p. 311.

4. L.S. Stavrianos, *op.cit.*, p. 238.

5. K.M. Ashraf, *Future of Historiography in India, Indian Historiography and other related papers*, 2006.

6. Rafiq Dossani, *India Arriving: How this Economic Powerhouse is Redefining Global Business*. p. 222.

7. http://agri.dawn.com

8. *Dawn*, 12 February 2012, p. 11.

9. *Ibid*


## کتابیات


*The Politics of Hunger: When Policies and Markets Fail the Poor*, Pesticide Action Network Asia and the Pacific (PAN AP), Penang, 2008.

Hameeda Hossain. *The Company Weavers of Bengal: The East India Company and the Organization of Textile Production in Bengal 1750-1830*, Oxford University Press, 1988.


اقتباس

# بیج کے ذریعے قبضہ[۱]

تحریر: نجمہ صادق      مترجم: حسین ناصر

ابوغریب کا نام دنیا کے لوگ غیر انسانی تشدد، غیر عدالتی کاروائی کی قید، امریکی حاکمیت اور یک طرفہ کاروائی سے منسوب کرتے ہیں۔ لیکن عراق کے کسان اس نام کو قومی بیج محفوظ کرنے کے لیے جین بینک سے پہچانتے ہیں جس نے ۷۰ کی دہائی میں کام کرنا شروع کیا تھا۔ عراق کی معروف گندم کا نام بھی ابوغریب ہے لیکن صد افسوس یہ قومی سرمایہ اب ناپید ہو گیا ہے۔

شام کو بھی اب اس بن بلائے مہمان کا سامنا ہے۔ وہاں خشک علاقوں میں زرعی تحقیق کے سینٹر ICARDA میں اب بھی عراق کے کچھ قدیم بیج موجود ہیں۔ تشویش کی بات یہ ہے کہ عراق کی زراعت کی تباہی کے منصوبے عام طور سے لوگوں کو معلوم نہیں۔ جدید عراق، قدیم میسوپوٹیمیہ کی اس زرخیز زمین کا حصہ ہے جہاں ۸ ہزار سے ۱۳ ہزار سال پہلے انسان نے گندم کی افزائش کی اور ہزاروں اقسام کی مقامی گندم پیدا کر کے ذخیرہ کی۔ امریکا نے جیسے ہی عراق پر قبضہ کیا تو یہ بات عیاں تھی کہ اس کی نظر بہ صرف تیل تک محدود نہیں تھی۔ ۲۰۰۴ء میں، پاؤل بریمر نے، جو عبوری اتھارٹی کے عسکری سربراہ تھے، ۱۰۰ سے زیادہ حکم نامے جاری کر کے عراق کی خود مختاری تار تار کر دی۔ عراقی عوام کی معیشت کے لیے سب سے زیادہ تباہ کن ان کا حکم نامہ نمبر ۸۱ تھا جو دوسری چیزوں کے علاوہ پودوں کی اقسام اور پیٹنٹ کے حوالے سے تھا۔ اس کا مقصد ظالمانہ طریقے سے واضح اور مکمل یعنی عراق کی روایتی پائیدار زراعت کا خاتمہ اور اس کی جگہ تیل، کیمیائی اور جینیاتی طور سے تبدیل شدہ بیج کی بنیاد پر صنعتی زراعت کا قیام تھا۔

اس حکم نامے پر عوام کی نہ رائے لی گئی اور نہ کوئی پارلیمانی بحث کو ضروری سمجھا گیا۔ مفتوح قوم کے لیے، جو اپنے اوپر یہ جنگ کو نہیں چاہتی تھی، فاتح طاقت نے عراق کے ۱۹۷۰ء کے پیٹنٹ قانون میں یکطرفہ تبدیلی کی جس کے بعد پودوں کی اقسام کو پیٹنٹ کیا جا سکے گا، یہ کام اس سے پہلے ناممکن تھا۔ عراق میں جینیاتی طور سے تبدیل شدہ بیج کے داخلے کا راستہ کھول کر کسانوں کو اپنے بیج جمع کر کے محفوظ کرنے کی بھی ممانعت کر دی گئی۔ ایف اے او کے مطابق امریکا کے قبضے تک عراق کے ۹۷ فیصد کسان اپنے ہی جمع شدہ بیج استعمال کرتے تھے۔

ایک جنبش قلم سے عراق کی زراعت کو تباہ کر دیا گیا۔ آرڈر نمبر ۸۱ نے مہنگے کارپوریٹ بیج متعارف کرانے اور عام کرنے کا دروازہ کھولا جس سے سب سے زیادہ فائدہ خود امریکا ہی کو پہنچا۔ ان بیجوں سے پیداوار حاصل کرنے کے لیے کیمیائی کھاد اور کیڑے مار مواد کا استعمال ضرورت بن جاتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ عراق کے بیشتر عوام جن کا زمین سے پیداوار حاصل کرنے پر کچھ خرچ نہ آتا تھا اب بیج اور دوسرے زرعی مواد کی خریداری کے لیے بھاری قرض لینے پر مجبور ہو گئے ہیں۔ اس سے یا تو انہیں کم آمدنی پر اکتفا کرنا پڑے گا یا پھر وہ زراعت چھوڑنے پر مجبور ہوں گے۔ بن بلائے مہمان نے عراق میں زراعت سے وابستہ لوگوں پر جبر کر کے زراعت کو یکسر تبدیل کر دیا ہے، بین الاقوامی مبصر غلط نہیں کہتے کہ دانستہ عراق کی زراعت کو مٹانا انتہائی سنگین جرائم میں شامل کیا جانا چاہیے۔

۱۔ دی ایکسپریس ٹریبون ۲۹ فروری ۲۰۱۲ء صفحہ ۷

# یوریا کا بحران

تحریر: صبیحہ حسن

یوں تو افغانستان میں امریکی مداخلت کا ساتھ دینے سے پاکستان ۱۹۷۹ء سے ہی بحرانوں کی زد میں ہے لیکن پچھلے چند سالوں سے بحرانوں کی فہرست میں کچھ زیادہ ہی اضافہ ہوا ہے۔ ۲۰۰۵ء میں قیامت خیز زلزلہ پھر ۲۰۰۸-۲۰۰۹ء میں خوراک کا عالمی بحران، ۲۰۱۰ء میں ملک کے طول و عرض میں خوفناک سیلاب اور پھر ۲۰۱۱ء میں سندھ میں موسلا دھار بارش نے عوام کی کثیر آبادی کو متاثر کیا۔ دوسری طرف مختلف وجوہات کی بنا پر توانائی کا بحران شدت اختیار کرتا گیا اور ۲۰۱۱ء کے آخر میں اس بحران نے زراعت کے لیے یوریا کا بحران پیدا کیا۔ اگر دیکھا جائے تو ان بحرانوں میں سے کوئی بھی بحران قدرتی آفت یا ناگہانی نہیں۔ ان سب کی گہری جڑیں تو اس نظام میں ملتی ہیں جو دنیا پر پچھلے پانچ سو سال سے چھایا ہوا ہے اور جس نے پچھلی صدی کے آخر سے واحد نظام ہونے کا دعویٰ شروع کر کے لوٹ مار کا نیا بازار گرم کیا ہوا ہے۔ ماحولیاتی تباہی ہو یا موسمی تبدیلی یہ نظام ہی سب سے پہلے اس کا ذمہ دار ہے۔ کارپوریٹ طبقہ جس کی نظر صرف اپنے منافع پر ہوتی ہے اس سے عوامی بھلائی کی توقع خام خیالی ہے۔ اس کے مفادات کے لیے حکومتیں کمزور کر دی گئی ہیں اور عوام اپنی بے بسی پر خود تماشہ بن گئے ہیں۔ پاکستان میں تو جمہوری حکومتوں کے پاس یہ اختیار اور بھی محدود ہے۔ اس محدود اختیار کو ہوشیاری اور ذمہ داری سے استعمال کرنے کی ضرورت ہے۔

## یوریا کا استعمال: پس منظر

سبز انقلاب نے جس قسم کے بیج متعارف کرائے وہ قدرتی بیج سے بہت مختلف تھے جنہیں کسان ہزاروں سال سے اپنی فصلوں کے لیے لگاتے اور بچاتے چلے آئے تھے۔ قدرتی بیج سے نکلنے والے پودے کی جڑیں زمین کے اندر گہرائی تک جاتی ہیں جبکہ زیادہ پیداوار دینے والے بیج (ایچ وائی ویز اور ہائبرڈ) کی جڑیں زمین میں تھوڑا اندر جانے کے بعد پھیل جاتی ہیں اور اپنی خوراک زمین کی اوپری تہہ سے حاصل کرتی ہیں اس لیے ان کے لیے مصنوعی کھاد ضروری ہے۔ اس طرح ایسے بیج کے پودوں پر زیادہ نرم ہونے کی وجہ سے کیڑا لگنے کا خدشہ بھی بہت زیادہ ہوتا ہے۔ لہٰذا کیڑے مار زہریلی ادویات بھی ایسے بیج کی کاشت کا حصہ ہیں۔ ان بیجوں کو پانی بھی زیادہ درکار ہوتا ہے۔ سب کچھ یعنی بیج، کھاد اور دوا ایگرو کیمیکل کمپنیاں ہی بناتی ہیں اس لیے دنیا کی زراعت اب ان چند کمپنیوں کے ہاتھ میں ہے۔ سبز انقلاب سے رائج زراعت نے جہاں ہمارے کسانوں کو زیادہ سے زیادہ پیداوار کی لالچ میں خود کفالت سے ہٹا کر کمپنیوں کی محتاجی کے راستے پر لگا دیا وہاں زمین، پانی اور ماحول کے لیے بے تحاشہ مسائل بھی پیدا کیے۔

ہماری حکومتیں ۱۹۶۰ء سے لے کر اب تک محتاج زراعت کے ماڈل کو بڑے زور و شور سے فروغ دے رہی ہیں۔ نیشنل فرٹیلائزر ڈیولپمنٹ سینٹر (این ایف ڈی سی) کے مطابق مصنوعی کھاد سے ۳۰ سے ۶۰ فیصد زیادہ پیداوار حاصل ہوتی ہے۔[1] اس بات کا جواب اگر بہت آسان طریقے سے دیا جائے تو یہ ہے کہ نشہ کرنے والوں کا دماغ بھی نشے سے بہت تیز چلتا ہے لیکن پھر ان کے پورے وجود کا کیا ہوتا ہے یہ بھی سب کو معلوم ہے۔ مصنوعی بیج نے ہماری فصلوں کو جن نشہ آور چیزوں کا عادی بنا دیا ہے ان کی قیمت میں آزاد تجارت کے دور میں بڑی تیزی سے اضافہ ہوا ہے۔ اگر ہم صرف مصنوعی کھاد کو لے لیں تو اس کی قیمت ہمارے ملک میں ۱۹۹۰-۱۹۹۱ء سے ۲۰۱۰-۲۰۱۱ء (جولائی مارچ) تک کچھ یوں رہی:

جدول ۱: یوریا کی قیمت

| سال | ڈی اے پی (قیمت فی ۵۰ کلوگرام) | یوریا (قیمت فی ۵۰ کلوگرام) |
|---|---|---|
| ۱۹۹۰-۱۹۹۱ | ۴۳۹ | ۱۹۵ |
| ۲۰۰۹-۲۰۱۰ | ۲,۲۹۷ | ۷۹۹ |
| ۲۰۱۰-۲۰۱۱ (جولائی تا مارچ) | ۳,۱۳۱ | ۹۸۵ |

حوالہ: فیڈرل بیورو آف اسٹیٹسٹکس، نیشنل فرٹیلائزر ڈیولپمنٹ سینٹر

جدول ۱ سے پتہ چلتا ہے کہ ۲۰۰۹-۲۰۱۰ء سے یوریا اور ڈی اے پی کی قیمتوں میں اضافہ بہت تیزی سے ہوا۔[2] اس دوران مقامی طور پر یوریا کی پیداوار ۳۰۰۰ سے ۳۵۰۰ ہزار ٹن سے کچھ ہی زیادہ تھی جبکہ حکومت کو ہر سال تقریباً ۶۰۰ ہزار سے ۱۴۰۰ ہزار ٹن مصنوعی کھاد درآمد کرنی پڑی (جدول ۲)۔ درآمد شدہ مہنگی یوریا کو کسانوں کو سستے دام دینے کا کام بھی حکومت کا ہے۔ ملک کی گرتی ہوئی معیشت پر یہ کتنا بڑا بوجھ ہے اس پر مکمل تحقیق کی ضرورت ہے۔ زرعی مداخل کی بڑھتی ہوئی قیمت کا کسان خاص کر چھوٹے کسان پر کیا اثر پڑ رہا ہے یہ موضوع بھی تفصیلی تحقیق کا محتاج ہے۔ ہمارا یہ مضمون تو اس سلسلے کی تھوڑی سی عکاسی کرتا ہے۔

جدول ۲: یوریا کی پیداوار اور درآمد

('000' N/Tons)

| سال | اندرون پیداوار | فیصد تبدیلی | درآمد | فیصد تبدیلی | کل |
|---|---|---|---|---|---|
| ۲۰۰۶-۲۰۰۷ | ۲۷۴۷ | -۳.۰ | ۷۹۶ | -۳۷.۴ | ۳۵۴۳ |
| ۲۰۰۷-۲۰۰۸ | ۲۸۲۲ | ۲.۷ | ۸۷۶ | ۱۰.۱ | ۳۶۹۸ |
| ۲۰۰۸-۲۰۰۹ | ۲۹۰۷ | ۳.۰ | ۵۶۸ | -۳۵.۱ | ۳۴۷۵ |
| ۲۰۰۹-۲۰۱۰ | ۳۰۸۲ | ۶.۰ | ۱۴۴۴ | ۱۵۴.۲ | ۴۵۲۶ |
| ۲۰۰۹-۲۰۱۰ (جولائی تا مارچ) | ۲۲۵۵ | - | ۱۱۳۶ | - | ۳۳۹۱ |
| ۲۰۱۰-۲۰۱۱ (جولائی تا مارچ) P | ۲۳۱۵ | ۲.۷ | ۵۶۳ | -۵۰.۴ | ۲۸۷۸ |

حوالہ: نیشنل فرٹیلائزر ڈیولپمنٹ سینٹر

## یوریا کا بحران (۲۰۱۱)

۲۰۱۱ء میں توانائی کے بحران نے جن بحرانوں کو جنم دیا اس میں یوریا کا بحران زراعت کے حوالے سے سب سے اہم ہے۔ توانائی کا بحران بنیادی طور سے تیل کی کمپنیوں کے بقایاجات کی عدم ادائیگی سے پیدا ہوا۔[۳] تیل کے بحران نے گیس کے استعمال پر دباؤ بڑھایا اور اس طرح گیس کی عدم دستیابی نے یوریا کے بحران کو پیدا کیا۔ ملک میں فرٹیلائزر کا شعبہ ۱۵ فیصد گیس استعمال کرتا ہے۔[۴] اس شعبے کو جون اکتوبر تک ۲۵ فیصد یا ۴۰۰ (mmcfT) کی کمی کا سامنا تھا لیکن گیس کی یہ کمی دسمبر تک ۱۲۰۰ (mmcfT) یومیہ ہوگئی۔[۵] ملک میں گیس نیٹ ورک بنیادی طور سے تین کمپنیوں پر مشتمل ہے: سوئی نادرن گیس پائپ لائن (SNGPL)، سوئی سدرن گیس پائپ لائن (SSGPL) اور ماری گیس۔ ان کمپنیوں کا مارکیٹ شیئر بالترتیب ۴۶ فیصد، ۲۹ فیصد اور ۱۵ فیصد ہے۔ اس کے علاوہ کچھ اور کمپنیاں ہیں جو توانائی کے شعبے کو براہ راست گیس سپلائی کرتی ہیں جن کا حصہ ۱۰ فیصد ہے۔[۶] یہاں یہ بھی بتانا مناسب ہوگا کہ ملک کی گیس کا تقریباً ۷۱ فیصد اب سندھ کی گیس فیلڈز سے آتا ہے۔[۷] سوئی پر قائم پلانٹز پر SNGPL کے چار پلانٹز یعنی پاک عرب فرٹیلائزر، اینگری ٹیک فرٹیلائزر، داؤد ہرکیولیز اور اینگرو کارپوریشن کی دھرکی کا پلانٹ (جو سندھ میں ہے) سب سے زیادہ کمی کے شکار ہوئے۔

اب اگر ہم یوریا کی پیداوار کی طرف آئیں تو نیشنل فرٹیلائزر ڈیولپمنٹ سینٹر کے اعداد و شمار کے مطابق:

- جنوری تا اکتوبر یوریا کی پیداوار میں ۲۲.۴ فیصد کمی آئی۔
- پیداوار ۲۰۱۰ء کے مقابلے میں ۴.۶۶۵ ملین ٹن کے بجائے ۳.۰۸۵ ملین ٹن تھی۔
- اس دوران یوریا کی درآمد میں ۳۸ فیصد کمی آئی۔[۸]

یعنی جنوری تا اکتوبر میں یوریا کی کمی کی بنیادی وجہ درآمد میں کمی تھی۔ لیکن اس سال اینگرو نے دھرکی پر نیا پلانٹ لگا کر SNGPL پر گیس کی ڈیمانڈ کو بڑھا دیا۔ کمپنی کا کہنا تھا کہ اگر اس پلانٹ کو پوری گیس فراہم کی جائے تو یوریا درآمد کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ یوریا کی کمی سے جنوری تا اکتوبر بلیک مارکیٹنگ کرنے والوں نے ذخیرہ اندوزی کرکے قیمتوں میں خوب اضافہ کیا۔

- جنوری میں فی بیگ قیمت ۸۲۵ روپے تھی جبکہ اکتوبر میں یہ قیمت ۱۳۹۲ روپے ہوگئی (جی ایس ٹی کے علاوہ)۔
- جنوری تا اکتوبر کے درمیان ڈی اے پی کی قیمت ۲۵۸۷ سے ۳۸۳۵ روپے فی بیگ ہوگئی۔[۹]

## یوریا کی درآمد اور خرد برد

اکتوبر کے شروع میں فرٹیلائزر کمپنیوں نے حکومت کو انتباہ کرتے ہوئے کہا وہ گیس کی سپلائی کمپنیوں کو بحال کرے یا پھر یوریا درآمد کرنے کی منصوبہ بندی کرے ورنہ ''زراعت کو سونامی کا سامنا کرنا ہوگا''۔[۱۰]

- اس کے بعد اینگرو کمپنی نے یوریا کی قیمت ۲۰۲ روپے فی بیگ (جی ایس ٹی کے ساتھ) اور ۱۷۴ روپے فی بیگ (جی ایس ٹی کے بغیر) بڑھانے کا اعلان کیا۔
- ۳۱ اکتوبر کو اینگرو نے فی بیگ قیمت مزید ۴۰۰ روپے بڑھانے کا اعلان کیا۔

کمپنی کا کہنا تھا کہ حکومت نے سندھ ہائی کورٹ کے فیصلے کی خلاف ورزی کی جس میں کمپنی کو گیس سپلائی جاری رکھنے کا حکم نامہ جاری کیا گیا تھا۔[۱۱] دراصل ۱۷ اکتوبر کو ملک بھر میں بجلی کی لوڈ شیڈنگ کے حوالے سے ہونے والے پرتشدد احتجاج کے بعد حکومت نے فوری طور پر فرٹیلائزر پلانٹس کی گیس بند کرکے پاور پلانٹ کو گیس کی فراہمی شروع کردی تھی۔[۱۲] حکومت کے دباؤ پر اینگرو نے ۲ نومبر کو اپنا فیصلہ واپس لے لیا۔ اسی دن صنعت کے وفاقی وزیر چودھری پرویز الٰہی کی سربراہی میں ایک میٹنگ کے دوران فیصلہ کیا گیا تھا کہ یوریا بنانے والی کمپنیوں کی طرف سے قیمتوں کے اضافے کے فیصلے کے کیس کو کمپیٹیشن کمیشن آف پاکستان اور دوسرے متعلقہ اداروں تک لے جایا جائے۔ میٹنگ میں کہا گیا کہ اضافہ کرنے والی کمپنیاں حالات سے فائدہ اٹھانے کے لیے cartel (گروہ بندی) کی طرح کام کر رہی ہیں۔[۱۳] اس کے علاوہ کابینہ کی اقتصادی کمیٹی نے یوریا درآمد کرنے کا فیصلہ بھی کیا۔ اس فیصلے کے تحت ٹریڈنگ کارپوریشن کو یوریا درآمد کرنے کا کام سونپا گیا تھا۔ درآمد کی جانے والی کھاد کی بندرگاہ سے ٹرانسپورٹیشن اور مارکیٹنگ کی ذمہ داری نیشنل فرٹیلائزر مارکیٹنگ کے سپرد کی گئی تھی۔[۱۴]

- حکومت نے ۲۲ اگست کو یوریا درآمد کرنے کے لیے ٹینڈر جاری کر دیے تھے۔
- سعودی فنڈ برائے ڈیولپمنٹ کی کریڈٹ فسیلٹی کے تحت ۲ لاکھ ۴۰ ہزار میٹرک ٹن یوریا اکتوبر تک فراہم کی جاچکی تھی۔
- ۳ لاکھ ۹۰ ہزار میٹرک ٹن بین الاقوامی ٹنڈر کے ذریعے درآمد کی گئی۔
- نومبر کے مہینے میں گوادر پورٹ پر درآمدی یوریا کے جہاز بڑی تعداد میں لنگر انداز ہونے شروع ہوگئے تھے۔[۱۵]
- ۵ دسمبر کو وفاقی وزیر برائے صنعت چودھری پرویز الٰہی نے کہا کہ فرٹیلائزر کی بہت بڑی مقدار گوادر پورٹ سے ملک کے مختلف علاقوں میں بھیج دی گئی ہے۔[۱۶]
- ۱۴ دسمبر کو کابینہ کی اقتصادی کمیٹی نے چودھری پرویز الٰہی کے کہنے پر ربیع کی فصل کے لیے مزید ۲۰۰,۰۰۰ ٹن یوریا درآمد کرنے کی بھی منظوری دی۔[۱۷]

یوریا کو درآمد کرنے کے باوجود زراعت میں یوریا کی کمی کا بحران ختم نہیں ہوا۔ اس کی وجہ درآمدی یوریا کی ترسیل میں بڑے پیمانے کی خرد برد تھی۔ ۱۵ دسمبر کو پارلیمانی پینل کو بتایا گیا کہ وزارت صنعت نے ۱۲۵، ۶۸ ٹن یوریا کو پچھلے پانچ مہینوں میں مختلف ڈیلرز کو فروخت کیا لیکن یہ یوریا اب کہاں ہے اس کا کچھ پتہ نہیں۔ یہ خدشہ ظاہر کیا گیا کہ بلیک مارکیٹ میں یہ یوریا بیچ کے کروڑوں روپے کمائے گئے ہیں۔[۱۸] پنجاب کے وزیر زراعت ملک احمد علی اولاکھ نے بھی وفاقی حکومت پر درآمدی یوریا کی تقسیم میں بدعنوانی کا الزام لگاتے ہوئے کہا کہ نیشنل فرٹیلائزر مارکیٹنگ کے ذریعے ۴۳ فیصد ڈیلروں کو دی گئی درآمدی یوریا کا کچھ حساب نہیں ملتا۔ پنجاب کو اکتوبر، نومبر میں ۶۷۵,۰۰۰ ٹن یوریا فراہم ہوئی جبکہ اس کو ۸۳۵,۰۰۰ کی ضرورت تھی۔[۱۹] کسانوں کی انجمنوں نے لاہور میں ۲۹ دسمبر کو ایک مشترکہ بیان میں حکومت کی پالیسی پر تنقید کرتے ہوئے کہا کہ حکومت بلیک مارکیٹ کرنے والوں کو سبسڈی دے رہی ہے۔ ان کے مطابق حکومت انہیں ۱۳۰۰ روپے فی بیگ کے حساب سے بیچ رہی ہے (جبکہ حکومت نے اسے ۲۹۵۰ روپے فی بیگ کے حساب سے خریدا تھا) لیکن کسانوں کو بلیک مارکیٹنگ کی وجہ سے یوریا ۱۷۵۰ روپے فی بیگ یا اس سے بھی زیادہ قیمت پر فروخت کی جارہی ہے۔[۲۰] اسی دن حکومت

نے خود اپنی ایک انکوائری رپورٹ میں اعتراف کیا کہ ۲۰۰۹ـ۲۰۱۱ کے درمیان ایک طاقت ور گروپ نے، جس میں وفاقی وزیر، منتخب نمائندے اور اعلیٰ سول حکام شامل ہیں، ۳۰۰ بلین روپے خرد برد کیے درآمدی یوریا کی غیر قانونی ذخیرہ اندوزی، اسمگلنگ اور بلیک مارکیٹ سے۔ رپورٹ میں بتایا گیا کہ یوریا کی تقسیم کے وسیع اور تفصیلی نیٹ ورک نے کیسے کسانوں کو مراعات پر یوریا فراہم کرنی بند کر کے عالمی مارکیٹ کے ریٹ ادا کرنے پر مجبور کیا۔[۲۱] کہتے ہیں کہ حکومتی دوستوں (cronies) نے بغیر روپے خرچ کیے صرف پرمٹ بیچ کر کے بلین روپے بنائے۔[۲۲]

## کارپوریٹ سیکٹر کا بڑھتا منافع اور کسانوں کا نقصان

کارپوریٹ سیکٹر نے گیس کی عدم دستیابی کا شور مچا کر یوریا کی قیمت میں مسلسل اضافہ کیا۔ یہ دیکھا گیا کہ جو کمپنی گیس کی کمی کا سب سے زیادہ شکار ہوتی وہی قیمت کا تعین بھی کرتی باقی اسی حساب سے اپنی قیمت میں اضافہ کرتیں۔[۲۳] ۲۱ دسمبر کے اعداد و شمار کے مطابق فرٹیلائزر کمپنیوں نے شیئر مارکیٹ میں آئل اور گیس کارپوریشن کو پیچھے دھکیل کر پانچ بڑے اسٹاک میں سے چار سب سے بڑے اپنے ہاتھ میں لے لیے۔ ان میں فاطمہ فرٹیلائزر کے ۹ء۸ بلین شیئرز، اینگرو کے ۹ء۳ بلین شیئرز، فوجی فرٹیلائزر کے ۲ بلین شیئرز اور بن قاسم کے ۲۴ بلین شیئرز تھے۔[۲۴] ۳۱ دسمبر ۲۰۱۱ء کو ختم ہونے والے سال کے دوران اینگرو کمپنی کا خالص ریونیو ۲۰۱۰ء کے ۹ء۷ بلین روپے کے مقابلے میں ۶ء۱۱۴ بلین رہا۔[۲۵] دوسری طرف زرعی مداخل کی بڑھتی ہوئی قیمتوں نے کسانوں کی کمر توڑ کر رکھ دی ہے۔ خود فرٹیلائزر سیکٹر کی ایک رپورٹ کے مطابق:

> گزشتہ دو سالوں میں زمین کی تیاری میں ۹۱ فیصد، بیج کی بوائی میں ۵۳ فیصد، پانی میں ۱۰۵ فیصد، فرٹیلائزر میں ۱۰۷ فیصد، فرٹیلائزر ڈی اے پی / ایم او پی میں ۱۱۳ فیصد، کیڑے مار ادویات وغیرہ کی قیمتوں میں ۷ فیصد، ہارویسٹنگ کے اخراجات میں ۴۷ فیصد اور پوسٹ ہارویسٹنگ اخراجات میں ۴۷ فیصد اضافہ ہوا۔[۲۶]

قیمتوں میں اضافے کی وجہ سے یوریا اب کسانوں کی قوت خرید سے باہر ہو گئی ہے۔[۲۷] اس لیے اس کے استعمال میں نمایاں کمی واقع ہوئی۔ مداخل کی قیمتوں سے فصل مہنگی ہونے کی وجہ سے عالمی منڈی میں، جس کے لیے کسانوں کو زیادہ سے زیادہ مداخل ڈال کر پیداوار بڑھانے پر اصرار کیا جا رہا ہے، اب ہماری قوت مقابلہ کم سے کم ہوتی جا رہی ہے۔ عالمی منڈی خود مندی کے رجحان میں مبتلا ہے اور دوسری طرف عام لوگ مہنگی خوراک اور بے روزگاری کی وجہ سے بھوک کا شکار ہو رہے ہیں۔ گندم ہماری بنیادی خوراک ہے لیکن پچھلے سالوں میں اس کے استعمال میں تقریباً ۲۲ فیصد کمی آئی ہے۔ ۱۹۹۳ء میں ایک پاکستانی ۳۸ء۱۰ کلو آٹا کھاتا تھا، رواں سال میں یہ مقدار ۸ کلو فی کس سے بھی کم ہو گئی۔ سبزیوں کے استعمال میں ۴۰ فیصد اور دالوں کے استعمال میں ۵۵ فیصد کمی آئی۔[۲۸] اس کمی کے باوجود یہ بات بھی عیاں ہے کہ اب ایک پاکستانی خاندان اپنی ماہانہ آمدنی کا ۷۰ فیصد صرف خوراک پر خرچ کر رہا ہے۔

## کیا کوئی حل ممکن ہے؟

اگر ہم تجزیہ کریں تو ہمیں مسائل کے حل کا دائرہ بہت تنگ نظر آتا ہے۔ ہم سے کہا جا رہا ہے اگر ہم بدعنوانی سے چھٹکارا حاصل کر لیں اور ٹیکس نیٹ کو وسیع اور فعال بنا لیں تو اس سے بہت کچھ ممکن ہے۔ لیکن یہاں یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ ترقی کے کس ماڈل اور کن عسکری ضرورتوں نے ہمارے ملک کو قرض کے دلدل میں دھکیلا جس کی ادائیگی کے لیے مزید قرضے لیے جا رہے ہیں۔ دوسرے اس قرض کی ادائیگی کے لیے حکومتی ذمہ داریوں کو کم کرنے اور عوام پر ٹیکس میں اضافے کے مشورے دے کر ہماری خود انحصاری کو ختم کر کے آزاد تجارت کو ہم پر کون مسلط کر رہا ہے اور یہ مشورے کس طبقے، عالمی قوتوں اور ممالک کے مفادات کو فروغ دے رہے ہیں؟ ان سب کا جواب اب عام پاکستانی کو بخوبی معلوم ہے۔ ملک کی اکثریت کے لیے ترس کھا کر غربت کو دور کرنے کے منصوبے بنائے جا رہے ہیں۔ دراصل یہی اکثریت چھوٹے اور بے زمین کسانوں پر مشتمل ہے۔ اکثریت اپنی خود انحصاری پر انحصار کرتے ہوئے، سبز انقلاب کے طریقوں کو خیر باد کہہ کر اور پائیدار زراعت کے طریقوں کو اپنا کر، ملک کو استحکام دے سکتی ہے۔ مصنوعی کھاد، مصنوعی بیج کی ضرورت ہے، قدرتی بیج کی نہیں۔ قدرتی بیج کے ساتھ جانور، گھاس پھوس اور پتوں کی کھاد کا استعمال نا صرف ہمیں صاف ستھری خوراک فراہم کر سکتا ہے بلکہ یہ ماحول کو بھی بہت بڑے اور سنگین مسائل (جن کی تفصیل اگلے مضمون میں دیکھیے) سے بچا سکتا ہے۔ پاکستان مال مویشی کے حساب سے دنیا کے بڑے ممالک میں شامل ہے، خالص داخلی پیداوار (جی ڈی پی) کا ۵ء۱۱ فیصد مال مویشی سے حاصل ہوتا ہے اور زرعی اضافی قدر سے حاصل (value added) اشیا میں ان کا حصہ بہت زیادہ ہے۔ پاکستان اکنامک سروے کے مطابق غربت دور کرنے میں مال مویشی کا فروغ ایک بڑا کردار ادا کر سکتا ہے۔[۲۹] اپنے لیے غذا کا مکمل انتظام کرنے کے بعد وافر پیداوار کو بیچنے کے لیے کسانوں کو مقامی منڈیوں پر اپنے قبضے کو بھی یقینی بنانا ہے۔ اس سلسلے میں بے زمین کسانوں کو زرعی زمین کی منصفانہ تقسیم کے لیے اپنی جدوجہد کو تیز اور مربوط کرنا ہے تب ہی جا کر یہ ممکن ہو گا کہ ملکی ترقی کا پہیہ صحیح سمت میں گھومنا شروع ہو اور جمہوریت کی بنیادیں مستحکم ہوں۔

## حوالہ جات


۱۔ اکانومکس سروے ۲۰۱۰-۲۰۱۱، حکومت پاکستان فنانس ڈویژن اکانامک ایڈوائزرز ونگ، اسلام آباد، صفحہ ۲۱۔
۲۔ ایضاً، صفحہ ۲۳۔
۳۔ پاکستان الیکٹرک پاور کمپنی (PEPCO) کو توانائی کے شعبے کے مختلف ذرائع کو ۳۶۵ بلین روپے بقایا جات کی صورت میں ادا کرنے ہیں جبکہ اتنی ہی رقم سرکاری اور غیر سرکاری ذرائع سے واجب ادا ہے جو اسے وصول کرنی ہے۔ دی نیوز، ۳۰ مارچ ۲۰۱۲، صفحہ ۱۸۔
۴۔ دی ایکسپریس ٹریبیون ۲۱ جون ۲۰۱۱ء۔
۵۔ ایضاً، ۱۷ دسمبر ۲۰۱۱ء۔
۶۔ ایضاً، ۲۱ جون ۲۰۱۱ء۔
۷۔ ایضاً، ۱۷ دسمبر ۲۰۱۱ء۔
۸۔ ڈیلی ٹائمز، ۱۷ نومبر ۲۰۱۱ء۔
۹۔ دی ایکسپریس ٹریبیون، ۱۷ دسمبر، ۲۰۱۱ء۔
۱۰۔ ڈان، ۲۹ نومبر، صفحہ ۱۵۔
۱۱۔ ایضاً، اکتوبر ۲۰۱۱، صفحہ ۹۔
۱۲۔ ایضاً، ۵ اکتوبر ۲۰۱۱، صفحہ ۵۔
۱۳۔ ایضاً، ۱۸ اکتوبر ۲۰۱۱، صفحہ ۲۔
۱۴۔ جنگ، ۷ اکتوبر ۲۰۱۱، صفحہ ۴۔
۱۵۔ ڈان، ۳ نومبر ۲۰۱۱، صفحہ ۹۔
۱۶۔ دی نیوز، ۹ دسمبر ۲۰۱۱، صفحہ ۲۔
۱۷۔ ڈان، ۱۳ دسمبر ۲۰۱۱۔
۱۸۔ دی ایکسپریس ٹریبیون، ۱۴ دسمبر ۲۰۱۱، صفحہ ۱۱۔
۱۹۔ دی نیوز، ۲۰ دسمبر ۲۰۱۱، صفحہ ۱۴۔
۲۰۔ ایضاً، ۳۰ دسمبر ۲۰۱۱، صفحہ ۱۸۔
۲۱۔ دی ایکسپریس ٹریبیون، ۳۰ دسمبر ۲۰۱۱، صفحہ ۱۴۔
۲۲۔ احمد فراز خان، ڈان اکنامک اینڈ بزنس ریویو ۱۹ـ۲۵ مارچ ۲۰۱۲، صفحہ III
۲۳۔ ایضاً
۲۴۔ ڈان، ۲۲ دسمبر ۲۰۱۱، صفحہ ۹
۲۵۔ جنگ، ۱۸ فروری ۲۰۱۲، صفحہ ۴۔
۲۶۔ فاخر ملک ''زرعی مداخل کی قیمتوں میں اضافہ''، جنگ، ۲۷ فروری ۲۰۱۲، صفحہ ۸۔
۲۷۔ جنگ، ۷ فروری ۲۰۱۲، صفحہ ۴۔
۲۸۔ محبوب مرغوب' ملک میں زرعی مصنوعات کی کمی' جنگ، پہلی فروری ۲۰۱۲ء۔
۲۹۔ پاکستان اکنامک سروے ۲۰۱۰-۲۰۱۱، صفحہ ۲۷۔

# مصنوعی کھادوں کا مسئلہ[1]

تحریر: غزل نسیم　　　مترجم: سید اظفر رضا

باقاعدہ تعریف کی رو سے مصنوعی کھاد غیر نامیاتی مرکب ہے جسے مصنوعی انداز سے بنا کر مٹی میں شامل کیا جاتا ہے تاکہ پودے کی نشوونما کے لیے ضروری ایک یا زائد غذائی اجزا کو مہیا کیا جاسکے۔ بیشتر مصنوعی کھادیں نائٹروجن اور فاسفورس کی بڑی مقدار سے لیس ہوتی ہیں۔ تجارتی پیمانے پر بننے والی دیگر اشیا کی طرح مصنوعی کھادیں بڑے کارخانوں میں تیار کی جاتی ہیں۔ ہوا سے نائٹروجن اور چٹانوں سے فاسفورس حاصل کیا جاتا ہے۔ ہوا کی آزاد نائٹروجن آسانی سے نائٹریٹ میں تبدیل کر کے کھاد کا حصہ بنا دی جاتی ہے۔ پھر پودا جڑوں کے ذریعے مٹی سے اسے جذب کر لیتا ہے۔ دوسری جانب فاسفورس چٹانوں سے حاصل کر کے فاسفیٹ میں تبدیل کیا جاتا ہے۔ یہ مختلف فاسفیٹ مٹی میں ڈالی جانے والی ان کھادوں کا اہم جزو ہوتے ہیں۔ آج کے طریقہ زراعت میں ان کھادوں کا بھرپور استعمال فطرت سے بالکل متضاد ہے اور ان کھادوں سے جنم لینے والے مسئلے کا باعث ہے۔ اس طرح کی کھاد کا استعمال غذائی اجزا کے بڑے پیمانے پر زیاں کا ذمہ دار ہے۔ سوال یہ ہے کہ یہ اجزا ضائع ہو کر کس چیز کا حصہ بن رہے ہیں؟ جواب انتہائی واضح ہے یعنی "ماحول"۔ مٹی میں شامل کی جانے والی ان کھادوں کی بڑی مقدار میں سے فقط ایک مخصوص حصہ ہی فصل کا جزو بنتا ہے، زیادہ تر مٹی میں ہی موجود رہ جاتا ہے۔ بعد ازاں آب پاشی اور بارش کے ذریعے یہ عناصر اور فاسفیٹ زمین میں اس گہرائی تک جا پہنچتے ہیں کہ زیر زمین آبی ذخائر سے جا ملتے ہیں اور انہیں زہریلا بنا دیتے ہیں۔ یوں مستقبل کے لیے قدرتی طور پر محفوظ آبی ذخائر محفوظ نہیں رہ جاتے۔ یہ آلودہ ہو کر انسانی استعمال کے لیے مضر ثابت ہوتے ہیں۔ نائٹریٹ سطح زمین سے آبی بخارات میں شامل ہو کر فضا میں امونیا کی تشکیل کرتے ہیں۔ جب ان زرعی علاقوں پر بارش برستی ہے تو امونیا کی موجودگی کے باعث زندگی کے لیے تباہ کن ثابت ہوتی ہے۔

ساتھ ہی ان عناصر کی بڑی مقدار بہتے پانی کے ساتھ دریاؤں اور جھیلوں میں جا گرتی ہے (یہاں بہتے پانی سے مراد پانی کا وہ بہاؤ ہے کہ جب کھیت مکمل طور پر پانی سے بھر جائیں اور زائد پانی بہہ کر نکل جائے)۔ نیا مسئلہ یوں جنم لیتا ہے کہ یہ کھادیں آبی حیات کے ماحول کا حصہ بن جاتی ہیں۔ پانی میں موجود کائی انہیں پا کر نہایت تیزی سے نشوونما پاتی ہے اور دیگر آبی حیات کو آکسیجن، سورج کی روشنی اور غذا سے محروم کرتی ہیں۔

کائی کی تیز ترین نشوونما والے ان علاقوں کو الجائی گنجان علاقے کہنا بہتر ہوگا۔

یہاں مسئلہ شدت اختیار کرتا ہے جب تمام غذائی عناصر کو استعمال کر کے الجائی موت کا شکار ہو جاتی ہے اور پانی مردہ نامیاتی مرکبات سے بھر جاتا ہے۔ اس حالت کو قلت آکسیجن کی حالت سمجھنا چاہیے یعنی آبی ماحول میں نائٹریٹ اور فاسفیٹ کی زیادتی وتباہ کاری' یہی حالت سطح زمین پر موجود پانی کے زوال کا سبب ہے۔ اہم اور حیرت انگیز حیاتیاتی اقسام کے گھر یعنی دریاؤں کے آخری چوڑے دہانے ان کھادوں کے باعث خطرات سے دوچار ہیں۔ ان دہانوں پر تازہ پانی کا توازن بگڑ رہا ہے اور آبی حیات کو نقصان پہنچ رہا ہے۔

آبی مسائل کے ساتھ ساتھ یہ کھادیں مٹی کی قدرتی ساخت کو تہس نہس کر کے چند سال اچھی فصلیں دینے کے بعد اسے بنجر بنا کر رکھ دیتی ہیں۔ مختصر مدت کا یہ فائدہ ہماری آنکھوں میں دھول جھونک کر ہمیں ہمیشہ کے نقصان جیسے بنجر پن اور پھر مکمل صحرائی حالت تک پہنچا دیتا ہے۔

ظاہراً دوست اور حقیقتاً دشمن یہ کھادیں آبی ماحول کے لیے خطرے کی گھنٹی ہیں اور تازہ پانی کو ہمارے استعمال کے لیے ناکارہ بنا رہی ہیں۔ انسانیت کو درپیش عالمی مسئلہ خوراک، مٹی کے دن بدن بڑھتے بنجر پن کے باعث شدت پر ہے۔ ہم ایک جانب پانی کی کمی سے نبرد آزما تھے ہی کہ کیمیائی کھادوں نے اس قلیل سرمائے کو بھی زہریلا بنانے کا عمل جاری رکھا ہوا ہے۔

آج کی زراعت میں ان عناصر کو دوبارہ کارآمد نہیں بنایا جاتا اور یوں یہ قلیل غذائی سرمائے کو مسلسل کم کر رہے ہیں۔ مصنوعی کھادیں زیادتی کے ساتھ استعمال ہو رہی ہیں اور یہ مسئلہ کئی گنا بڑھ چکا ہے۔ مصنوعی کھادوں کے اس مسئلے کا حل یہ ہے کہ ماحول دوست نامیاتی کھادیں استعمال کی جائیں جیسے جانوروں کے فضلے اور گلے سڑے پودوں اور ان کے حصوں سے بنی ہوئی کھادیں۔

ہمارے دروازے پر دستک دیتے ان خطرات سے نمٹنے کے لیے ہمیں فوری عمل کرنا ہوگا۔

ا۔ ڈان، ڈان میگزین، بزنس اور اکانومک ریویو، ۹ جنوری، ۲۰۱۲

## اے پی سی کی طرف سے عالمی یوم خواتین کے موقع پر کسان مزدور عورتوں کو سلام!

فصلوں کو پروان چڑھاتی، حقوق کا دفاع کرتی اور اپنی زمین اور خاندان کی محافظ کسان مزدور عورتوں کو ایشیائی کسان مزدور اتحاد کا خراج تحسین!

ایشیائی کسان مزدور اتحاد سالانہ بین الاقوامی یوم خواتین پر دنیا کے ہم قدم ہے۔

''آج ہم دنیا کی تمام کسان مزدور عورتوں کو حقوق نسواں کی جدوجہد کے احیا اور تسلسل کی دعوت دیتے ہیں۔ انصاف اور مساوات پر مبنی حقوق کے لیے عورتوں کی جدوجہد کو جن مشکلات اور رکاوٹوں سے دوچار کر دیا جاتا ہے ہم اس کی مذمت کرتے ہیں۔ خواتین دنیا بھر میں مختلف قسم کی جدوجہد کا اہم حصہ ہیں جہاں وہ مطالبات منوانے کے لیے مظاہروں، ایوانوں اور آزادی کی عوامی کوششوں میں کردار ادا کر رہی ہیں۔'' یہ الفاظ ہیں ایشیائی کسان مزدور اتحاد کی سربراہ اور بھارت کی دلت برادری سے تعلق رکھنے والی فاطمہ برناڈ کے۔

دوسری جانب زنیدہ سوریانو جو اسی تنظیم کی رابطہ کونسل کی ممبر اور قومی اتحاد برائے کسان مزدور (فلپائن) کی صدر ہیں کہتی ہیں، ''ہم ایشیا کی دیہی عورتوں کے کردار کو سراہتے ہیں کہ جنہوں نے اپنے آپ کو منظم کیا اور بی ٹی کپاس، بی ٹی بینگن، مخلوط النسل چاول، سنہری چاول، جی ایم اوز، زرعی کیمیائی تجارتی کارپوریشن کے خلاف تحریک چلائی۔ بنگلہ دیش، انڈونیشیا، بھارت اور فلپائن میں اپنی زمین کو دوبارہ حاصل کرنے اور قبضے سے بچانے میں اہم کردار ادا کیا اور ان کوششوں کو کامیاب بنایا''۔

اس بات پر برناڈ نے اضافہ کرتے ہوئے کہا: ''ہم خراج تحسین پیش کرتے ہیں کسان مزدور عورتوں کی ان انتھک کوششوں کو جو انہوں نے بیجوں کی افزائش کے سلسلے میں انجام دیں تاکہ روایتی بیجوں کو دوبارہ استعمال کیا جا سکے اور انہیں محفوظ بنا کر اپنی کسان برادری سے ان کا تبادلہ کیا جا سکے۔ اپنے روزگار اور زمینوں کے دفاع اور موثر زرعی اصلاحات کے لیے ان کی جدوجہد کو ہم قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں''۔

سوریانو نے زور دیا کہ ''ہم کسان مزدور عورت کو مزید فعال بنائیں گے تاکہ وہ استحصال کی زنجیریں توڑ کر بحیثیت عورتیں اپنے حقوق اور زرعی بیجوں کی دوبارہ افزائش کے حقوق منوا سکے''۔ ان کا مزید کہنا تھا کہ ''فلپائن اور انڈونیشیا جیسے نیم جاگیردارانہ معاشروں میں عورتیں اپنی زمین اور روزگار سے بحیثیت کسان مزدور اور زرعی محنت کش محروم کی جا رہی ہیں۔ اس کے ساتھ ہی کسان مزدور عورتیں بڑی تعداد میں بیدار ہو رہی ہیں اور ایشیا سمیت دنیا بھر میں اہم جدوجہد کا حصہ بن رہی ہیں''۔

---



## ریو پلس ۲۰ اجلاس کے موقع پر ایشیائی دیہی عورتوں کے اتحاد* کی طرف سے اعلامیہ:

## مستحکم ترقی ''سبز معیشت'' سے نہیں بلکہ جنس، معیشت اور ماحول پر مبنی انصاف سے ہی ممکن ہے

آج ۸ مارچ ۲۰۱۲ عالمی یوم خواتین کا انعقاد دیہی خواتین کے لیے اپنی کامیابیوں سے لطف اندوز ہونے کا ایک بہترین موقع ہے کہ جہاں سے انہوں نے اپنی آواز اجتماعی طور پر حقوق کی خاطر بلند کی اور خود اختیار آزاد نظام کی جدوجہد کے ذریعے مستحکم ترقی کی جانب گامزن ہونے کی راہ نکالی ہے۔ اگرچہ دوسری جانب شدت پزیر عالمی اقتصادی و معاشی بحران اور سرمایہ دارانہ قوتوں کی بڑھتی اجارہ داری عالمی وسائل اور افرادی قوت کا بھرپور استحصال کر کے مفادات کے حصول پر کمربستہ ہیں کہ گویا مستحکم ترقی کی جدوجہد کو راستے سے ہٹا دیں اور بالآخر ختم کر کے ہی دم لیں۔

بیس برس قبل مستحکم ترقی سے متعلق اقوام متحدہ کی کانفرنس ریو برازیل میں ہی منعقد ہوئی تھی۔ یہاں دنیا بھر کی حکومتوں نے کرہ ارض کو بچانے کے لیے بھرپور اقدامات کا عہد کیا تھا۔ لہذا اسے ارتھ سمٹ کے طور پر یاد رکھا گیا جون ۲۰۱۲ء میں برازیل کے شہر ریو میں ہونے والے اجلاس میں جائزہ لیا جائے گا کہ اس وقت طے شدہ مقاصد میں سے کس قدر پورے کیے گئے اور مستحکم ترقی کی راہ میں ابھی مزید کن اقدامات کی ضرورت ہے؟

دیہی آبادی کی کثرت کا حامل، ایشیا کا نصف خواتین پر مشتمل ہے جو خطے کا ستر فیصد غریب اور مفلوک الحال طبقہ ہے۔ ریو کے اولین اجلاس میں دیہی خواتین سے کیے گئے وعدے اب تک وفا نہ ہو سکے اور دنیا بھر کے چھوٹے کاشتکاروں کے لیے صورتحال بد سے بدتر ہو چکی ہے۔ موثر زرعی اصلاحات کی غیر موجودگی، زرعی کیمیائی تجارتی کارپوریشنوں کا زراعت میں بڑھتا ہوا عمل دخل اور حکومتی سرپرستی کا خاتمہ، دیہی غربت میں اضافے کے اہم اسباب ہیں۔ دیہی عوام بالخصوص خواتین روز بروز بڑھتے ہوئے تباہ کن ماحولیاتی اثرات کا شکار ہیں جو آب و ہوا کی تبدیلی کے باعث جنم لے رہے ہیں۔ وہ ان عوامل سے نہ سمجھوتہ کر سکتے ہیں اور نہ ہی ان کے پاس کوئی معین راہ ہے۔ قدرتی وسائل کا بے دریغ و بے جا استعمال اور زمینوں پر قبضے جاری ہیں۔ توسیع پسندانہ جنگیں، فوجی مہم جوئیاں اور افرادی قوت کی جبری ہجرت عروج پر ہے۔ دوسری طرف خواتین حمل اور وضع حمل جیسی معمولی پیچیدگیوں کی بھینٹ چڑھ رہی ہیں جن سے انہیں آسانی کے ساتھ محفوظ رکھا جا سکتا تھا۔ مختصر الفاظ میں یوں سمجھا جائے کہ موثر اور مستحکم ترقی کے بجائے محروم، منقسم اور اختیار سے محروم برادریاں نظر

آتی ہیں جو زہریلے اور تیزی سے آلودہ ہونے والے قدرتی وسائل پر زندگی گزارنے کے لیے مجبور ہیں۔

دیہی عورتیں دوہرے زخموں کا شکار ہیں۔ ایک طرف باقاعدہ روزگار سے محرومی اور کیمیائی مرکبات پر انحصار جو ان کی صحت اور اس ماحول کو برباد کر رہے ہیں جہاں ان کے افرادِ خانہ مقیم ہیں۔ دوسری طرف انہیں جینیاتی وسائل پر اختیار سے محروم کر دیا گیا ہے۔ طرہ یہ کہ انہیں جنسی زیادتی کا نشانہ بنایا جاتا ہے اور پھر یہ بھی کہ اپنی صحت بالخصوص جنسی اور تولیدی صحت کے حصول سے تو یکسر دور رکھا جاتا ہے۔ اس طرح ان کی خدمات کی قدر تو کجا انہیں تو معاشرتی، معاشی اور سیاسی تعصب کا ہی سامنا رہتا ہے۔

بدقسمتی یہ ہے کہ ریو میں اس اجلاس کے ابتدائی خاکے (زیرو ڈرافٹ) نے اس بات کو بالکل نظر انداز کر دیا ہے کہ کس طرح سرمایہ دارانہ انداز کی ترقی نے مستحکم ترقی کو ایک دور افتادہ حقیقت بنا دیا ہے۔ اس سے تو وہی قومیں نبرد آزما نظر آتی ہیں کہ جہاں عوامی تحریکیں جاری ہوں۔ یہ ابتدائی خاکہ سبز معیشت کے سبز باغ دکھانے میں مصروف نظر آتا ہے جس کا مقصد تو مستحکم ترقی اور غربت کا خاتمہ ہے جبکہ دراصل سبز معیشت سرمایہ داری سوچ کے اس نیو لبرل نظام کا ایک پہلو ہے جس کا مقصد مفادات کے نئے مواقع حاصل کرنا ہے۔ خود انحصار اور آزاد قوموں کے لیے سبز معیشت کا تصور ایک مستحکم ترقی کی ضامن منصوبہ ساز معیشت کا ہونا چاہیے نہ کہ تیز معاشی ترقی اور قدرتی وسائل کے استعمال پر مضبوط گرفت۔

قدرتی وسائل کے ضائع ہونے سے روکنے کا نعرہ لگا کر در پردہ کاروباری اداروں کے ذہنی ملکیتی حقوق کو استحکام بخشا جائے گا۔ نجی شراکت داری کو مزید فروغ دے کر دنیا بھر کے قدرتی وسائل کو بھی نج کاری کے عمل سے گزارا جائے گا۔ سبز معیشت دنیا میں کاربن کے اخراج کو روکنے میں سنجیدہ ہونے کے بجائے نجی اداروں کو اپنے فاضل اخراجات پورے کرنے کے لیے کاربن کی تجارت کی اجازت دیتی نظر آتی ہے۔ نئی ٹیکنالوجی کے ذریعے زراعت کو سرسبز بنانے کے جال کے پیچھے کاروباری اداروں کی زراعت میں سرمایہ کاری کی طرف رغبت نظر آ رہی ہے۔ بغور جائزہ لیں تو یہ ٹیکنالوجی کے بہروپ میں دنیا میں نئی منڈیاں لگانے کی طرف مائل نظر آتی ہے قدرت اور ایکو سسٹم کو تجارتی سے گزار کے "شے" (commodification) بنانے کی صورت میں زراعت پر کارپوریٹ سیکٹر کی مضبوط گرفت اور ضرر رساں ٹیکنالوجی کے مزید فروغ میں پیش پیش ہے اور مزید یہ کہ سبز معیشت منڈی مخالف عوامل کو ماحول کے لیے نقصان دہ قرار دے کر ورلڈ ٹریڈ آرگنائزیشن کے معاشی عدم مساوات پر مبنی تجارتی نظام کی معاونت کر رہی ہے۔

ابتدائی خاکہ اگرچہ صنفی مساوات کا عزم دہراتا نظر آتا ہے لیکن دیہی عورتوں کے لیے باعث تشویش امر یہ ہے کہ دور رس اقدامات اور مقاصد سے یکسر خالی ہے۔ مستحکم ترقی اور بنیادی انسانی حقوق کے ضمن میں حقوق نسواں کے حوالے سے یہ بہت ضروری ہے کہ فیصلہ سازی میں ان دیہی عورتوں کی بھرپور اور بامقصد شرکت یقینی بنائی جائے۔

ریو کے اس اجلاس میں دنیا کی کثیر آبادی کے نصف یعنی دیہی عورتوں کی آواز کو شامل ہونا چاہیے۔ ذمہ دارانہ صنفی مساوات پر مبنی پالیسیوں کے اجرا، زمین اور وسائل پر اختیار اور استعمال کے یقینی معاہدوں، جنسی و تولیدی صحت کی بہتری کے پروگرام وغیرہ کے لیے یہ ایک بھرپور موقع ہے تاکہ عورتوں کی حیثیت کو مانا جائے اور زندگی کے ہر شعبے میں عورتوں کی شرکت کو یقینی بنایا جا سکے۔ مستحکم ترقی کی منصوبہ بندی کرتے وقت دیہی عورتیں اور ان کے بچوں کی صحت، زراعت سے وابستہ محنت کش عورتوں کی فلاح اور حقوق کا تحفظ اور صنفی امتیاز و تشدد سے بچاؤ پر توجہ کی ضرورت ہے۔

سبز معیشت کا فریم ورک ان امنگوں کے حصول کا ذریعہ بنتا نظر نہیں آتا۔ ایشیا کی دیہی عورتوں کا اتحاد خوراک کی فراہمی اور حیاتیاتی ماحول کی حفاظت پر متبادل خاکے کو فروغ دینے پر زور دے رہا ہے جہاں غذائی خود مختاری اور حیاتیاتی تنوع پر مبنی صنفی، معاشی اور ماحولیاتی انصاف ہو عملی طور پر پیداوار کے تصور میں بنیادی تبدیلی کی ضرورت ہے۔ یہی دراصل مستحکم ترقی کو عوامی رہنمائی کے ذریعے دیہی برادریوں میں ممکن بنائے گا۔ ایشیائی دیہی عورتوں کا اتحاد اس یقین کا اظہار کرتا ہے کہ مستحکم ترقی کے ڈھانچے کی نشو و نما، نیو لبرل عالمگیریت کی تباہ کن پالیسیوں کی سنجیدہ مخالفت اور عوام بالخصوص عورتوں کی تحریکوں کے تعاون کے بغیر ممکن نہیں۔ ریو اجلاس اگر کرۂ ارض اور اس کے باسیوں کو واقعتاً بچانا چاہتا ہے تو اسے ان امور کی اہمیت کو تسلیم کرنا ہوگا۔ اے آر ڈبلیو سی (ایشین رورل ویمن کوالیشن) دیہی عورتوں کی زندگی، زمین اور حیاتیاتی اقسام پر اختیار کے حق پر زور دیتی ہے۔ دیہی عورتوں کے حق پر ایشیا کی دیہی عورتوں کا یہ اتحاد ایک بار پھر بھرپور زور دیتا ہے۔ (آزادی اختیار اور حقوق کی آواز۔ ایشیائی دیہی عورتوں کا اتحاد)

8 مارچ 2012ء

* Asian Rural Women's Coalition statement on the Rio+20 summit

# بات تو سچ ہے مگر... زرعی خبروں کا جائزہ (اکتوبر ۲۰۱۱ء تا مارچ ۲۰۱۲ء)

چیلنج کے اس شمارے میں بنیادی طور پر صرف تین موضوعات پر تین انگریزی اخباروں کی خبریں جمع کر کے ان سے کچھ رجحانات کو واضح کیا گیا ہے۔

## زمین سے متعلق خبریں اور تجزیے

پچھلے چھ مہینوں کی خبروں میں زمین کی خبروں کے حوالے سے مختلف نوعیت کی باتیں سامنے آئیں۔ ان خبروں کو مختلف پہلوؤں سے دیکھا جا سکتا ہے۔

زمین سے کسانوں کی بے دخلی: کسانوں کی ایک کثیر تعداد زمینوں سے بے دخل ہو رہی ہے۔ صرف پچھلے چھ مہینوں میں اس کی کئی شکلیں سامنے آئی ہیں۔ مثلاً بورڈ آف ریونیو نے ٹھٹھہ کے چار تعلقوں کی مقامی آبادی کی ۵۰ ہزار ایکڑ زمین منسوخ کر دی کیونکہ یہ زمین ذوالفقار آباد شہر کے منصوبے میں آتی ہے (ڈان، ۱۹ اکتوبر، صفحہ ۱۸)۔ اس سے ۲۸۰ گاؤں کے افراد متاثر ہوں گے (دی نیوز، ۲ نومبر، صفحہ ۱۸)۔ اسی طرح نیشنل ہائی وے اتھارٹی نے فیصل آباد، ملتان موٹر وے کے لیے بہت کم تخمینے پر کسانوں سے زمین حاصل کی تھی جس کے خلاف ٹوبہ ٹیک کے کسانوں نے ایولویشن کمیٹی کے خلاف مقدمہ دائر کیا (ڈان، ۱۹ اکتوبر، صفحہ ۲)۔ بھاشا ڈیم سے واپڈا نے ہوشیاری دکھاتے ہوئے ڈسٹرکٹ کوہستان کو پانچ فیصد رائلٹی اور ڈیم متاثرین کو فوری ادائیگی کا معاہدہ ۲۹ اکتوبر کو طے کیا (ڈان، ۳۰ اکتوبر، صفحہ ۵)۔

بیرونی ممالک کا پاکستان کی زمین پر قبضے کا ذکر بھی اس دوران سامنے آیا۔ ۲۰۰۴ء میں کراچی کے ساحلی علاقے میں دو بڑے جزیرے دبئی کی ایک کمپنی خرید چکی ہے، یہاں کے مچھیرے اب اس پریشانی میں جی رہے ہیں کہ کمپنی ان سے یہ جزیرے کب خالی کرالے (دی نیوز، ۲۲ نومبر، صفحہ ۱۹)۔ نومبر میں چین کی سب سے بڑی زرعی کمپنی کے نمائندوں نے وفاقی وزیر برائے غذائی تحفظ اور ریسرچ سے ملاقات میں ۱۰ ہزار ایکڑ زمین لیز پر لینے کی درخواست کی "پاکستانی کسانوں کے ساتھ مل کر سبزی اور پھل اگانے" کے لیے (دی نیوز، ۲۵ نومبر، صفحہ ۱۸)۔ اسی طرح ایک اور چینی کمپنی (یونائیٹڈ انرجی گروپ) کو حکومت سندھ نے یہ یقین دہانی کرائی ہے کہ وہ اسے ۳،۰۰۰ ایکڑ زمین ٹھٹھہ اور جامشورو کے اضلاع میں پاور جنریشن کے لیے فراہم کرے گی (دی ایکسپریس ٹریبیون، ۳۰ دسمبر، صفحہ ۱۰)

زمین ہتھیانے میں فوج بھی پیش پیش ہے۔ مانسہرہ میں بفا (Baffa) کے کسانوں کو یہ ڈر ہے کہ کب فوج کے گھوڑوں کے اصطبل ایبٹ آباد سے ہٹا کر ان کی ۲۲۰۰ کنال زمین پر بسائے جائیں گے جس پر ابھی وہ اچھے معیار کا تمباکو کاشت کرتے ہیں (ڈان، ۲ دسمبر، صفحہ ۵)۔ اسی طرح ایک خبر کے مطابق چھانگا مانگا میں کم زمین رکھنے والے ہزاروں متاثرین نے انٹیلی جنس ایجنسیوں کے خلاف مظاہرہ کیا جنہوں نے ان کی ہزاروں کنال زمین ہتھیاروں کے ڈپو کے لیے حاصل کر لی ہے (دی نیوز، ۲۰ فروری، صفحہ ۱۲)۔ پنجاب اسمبلی کو پنجاب کے وزیر قانون نے جنوری میں بتایا تھا کہ ۳۹۵،۵۷۶ ایکڑ زرعی زمین آرمی کے کنٹرول میں ہے جہاں پر کاشت، ڈیری فارمنگ وغیرہ کی جاتی ہے۔ اس کی آمدنی کا ریکارڈ خود ملٹری کے پاس ہوتا ہے، حکومت پنجاب کے پاس نہیں (ڈان، ۷ جنوری، صفحہ ۴)۔

زمین سے بے دخلی کے خلاف ۱۸ جنوری کو ٹھٹھہ میں کوہستان بچاؤ ایکشن کمیٹی کے تحت پی پی پی (ش ب)، عوامی تحریک اور پاکستان مسلم لیگ نواز کے نمائندوں کے ساتھ کئی سو افراد نے مظاہرہ کیا۔ ان کا کہنا تھا کہ ان کی ہزاروں ایکڑ زمین کو مقامی اور بیرونی کمپنیوں کو الاٹ کر دیا گیا ہے۔ انہوں نے خطرہ یہ بھی ظاہر کیا کہ اس زمین کے علاوہ ریونیو کا محکمہ بیرونی کمپنیوں کو دینے کے لیے ۱۵۰۰۰ ایکڑ زمین کا سروے کر رہا ہے (ڈان، ۱۹ جنوری، صفحہ ۱۸)۔

جنگلات کی زمین ماحول اور موسمی تبدیلی سے نمٹنے کے لیے بہت اہمیت رکھتی ہے۔ اس حوالے سے سندھ کے ریونیو کے محکمے کے خلاف ۲ مارچ کو دیہہ شاہ بخاری اور قاسم آباد تعلقہ کی آبادیوں نے جئے سندھ اور جئے سندھ قومی محاذ کے لیڈروں کے ساتھ مل کر پی پی کی حکومت پر الزام لگایا کہ اس نے علاقے کے جنگلات کی ۱،۳۳۶ ایکڑ زمین لینڈ مافیا کو ۲۰ روپے فی ایکڑ لیز پر دے دی ہے۔ اس پر انہوں نے سپریم کورٹ سے سوموٹو نوٹس لینے کا مطالبہ کیا۔ انڈس ڈیولپمنٹ آرگنائزیشن (آئی ڈی او) جو جنگلات کے تحفظ کے لیے کام کر رہی ہے کہ مطابق دیہہ بخاری میں ہزاروں ایکڑ زمین کی لیز سندھ ہائی کورٹ کے فیصلے کے خلاف ہے۔ سندھ ہائی کورٹ نے آئی ڈی او کی درخواست پر یہ حکم نامہ جاری کیا تھا کہ جنگلات کا نہ نام تبدیل کیا جا سکتا ہے، نہ رقبے میں کمی لائی جا سکتی ہے (ڈان، ۳ مارچ، صفحہ ۱۸)۔

جنگلات کی زمین کے قصے صرف پاکستان تک محدود نہیں، دنیا بھر میں جنگلات کاٹنے کا سلسلہ جاری ہے۔ پچھلے چھ مہینوں میں کمبوڈیا بوتم ساکور کے جنگلات کے حوالے سے خبر عام ہوئی کہ جنگل کی ۱۳۰ مربع میل زمین چین کی ایک اسٹیٹ ایجنسی نے جوا خانے کھولنے کے لیے حاصل کی ہے۔ تحفظ قدرتی وسائل کمبوڈیا کے گروپ کے ڈائریکٹر کے مطابق کمپنیوں کے ہاتھوں کمبوڈیا کے جنگلات اور جنگلی حیات کی پناہ گاہوں کا جلد خاتمہ دکھائی دے رہا ہے۔ بوتم ساکور کے ماہی گیروں کا کہنا ہے کہ وہ جنگلات کی زمین پر صدیوں سے رہتے آئے ہیں لیکن اب انہیں زبردستی بے دخل کیا جا رہا ہے (دی ایکسپریس ٹریبیون، ۱۰ مارچ، صفحہ ۱۰)

خوش آئند فیصلہ: سندھ کے کسانوں، لیبر یونین اور سول سوسائٹی کے نمائندوں نے پنجاب

کے کسان اور مزارعین کو مبارکباد پیش کی جن کی جدوجہد کے نتیجے میں پنجاب اسمبلی نے The Punjab Conferment of Propriety Rights on Occupancy Tenants and Mugarraridars Act, 2011" دسمبر ۲۰۱۱ء میں منظور کیا جو زمین تقسیم کرنے کے لیے قانونی ڈھانچہ فراہم کرتا ہے جس سے ۴۰۰,۰۰۰ ایکڑ سرکاری زمین ۲۰۰,۰۰۰ بے زمین کسانوں میں تقسیم کی جائے گی۔ کسانوں، لیبر یونین اور سول سوسائٹی کے نمائندوں نے سندھ میں قانون سازی کا مطالبہ کرتے ہوئے کہا کہ کسان نسلوں سے سرکاری زمین پر کاشت کرتے چلے آ رہے ہیں انہیں زمین پر حق ملنا چاہیے کیونکہ یہ حق انہی کا ہے۔ سرکاری زمین میں وہ زمین بھی شامل ہے جو سرکاری محکموں اور سیکورٹی فورس کے پاس ہے۔ ان کا یہ بھی مطالبہ تھا کہ تمام سرکاری زمین کا ریکارڈ عوام کے سامنے لایا جائے اور زرعی اصلاحات کو فروری ۲۰۰۹ء میں سندھ اسمبلی کی ڈپٹی اسپیکر کو پیش کردہ مطالبات کے تحت ممکن بنایا جائے۔ آئین کے آرٹیکل (۳)۸۴ کے تحت زرعی اصلاحات کا مطالبہ کرتے ہوئے سپریم کورٹ کی شریعت Apellate کے فیصلے کو بھی چیلنج کیا گیا۔ جس میں ۱۹۷۲ اور ۱۹۷۷ء کے اصلاحات کو غیر اسلامی قرار دیا گیا تھا۔ (زیب اختر حسین، "Labour unions clamour for land reforms in Sindh" دی نیوز، ۸ جنوری، صفحہ ۱۹)۔

## ماہی گیری اور زرعی شعبے کے مزدوروں سے ناروا سلوک اور جبری مشقت:

زمینداروں کا کسانوں خاص طور سے کسان اور دیہی عورتوں کے ساتھ ناروا سلوک آج بھی جاری ہے۔ ۱۶ جنوری کی یہ خبر ہے کہ سندھ تعلقہ چھاچھرو کے ایک 'گاؤں' کے زمیندار کے حکم پر ایک عورت کو برہنہ کر کے گھنٹوں تشدد کیا گیا (ڈان، ۱۲ جنوری، صفحہ ۱۸)۔ اسی طرح دی ایکسپریس ٹریبون کی ۳۱ جنوری، صفحہ ۹ کی خبر ہے کہ ایک بچہ جو اپنے گاؤں سے سات میل دور اسکول جایا کرتا تھا، بہاولپور میں ایک زمیندار نے اس کے پیچھے پانچ کتے صرف اس بات پر لگا دیے کہ وہ ہر روز اس کی زمین سے گزرتا تھا۔ جبری مشقت اور نجی جیلوں کے قصے بھی ان چھ مہینوں میں سامنے آئے۔ سکھر میں سومارو کے زمیندار چودھری اسلم قائم خانی کی نجی جیل سے پولیس نے ۳۶ جبری کھیت مزدور برآمد کیے جن میں ۹ عورتیں شامل تھیں۔ ان لوگوں کا کہنا تھا کہ زمیندار ان سے پچھلے کئی سالوں سے جبری مشقت کروا رہا تھا (دی نیوز، ۲۸ اکتوبر، صفحہ ۳)۔ جبری مشقت پر کئی اور خبریں خاص کر بارش سے متاثر افراد کے حوالے سے سامنے آئیں۔ ۱۹ دسمبر کی ایک خبر کے مطابق دو سیلاب متاثر خاندان جو کراچی کے قریب گڈاپ میں رہ رہے تھے انہیں ۱۲ دسمبر کو اغوا کر کے سانگھڑ کے ایک فارم پر پہنچا دیا گیا۔ ایک کسان جس کو وہاں سے فرار ہونے میں کامیابی ہوئی کہا کہ اس وجہ سے اس کے خاندان کو اب تشدد کا سامنا ہوگا۔ وہ لوگ تین نسلوں سے جبری مشقت کرتے آ رہے ہیں۔ اسی طرح کسان رہنما غلام حسین ملکانی نے عمرکوٹ میں کہا کہ فارم اور بھٹہ مالکان نے پچھلے سیلاب اور اب کی بارشوں کے بعد بہت سارے لوگوں کو جبری مشقت پر مجبور کیا۔ ان کے مطابق اس وقت ۲.۵ ملین افراد سندھ میں جبری مشقت کر رہے ہیں۔ جس میں سے ۴۵۰ ہزار افراد صرف عمرکوٹ ضلع میں ہیں (ڈان، ۲۲ دسمبر، صفحہ ۱۸)۔

### ہری پور میں سندھ کے مچھیروں کی جبری مشقت

یہ ہری پور ہے، یہاں ماہی گیروں کے ستر خاندان آباد ہیں جو قرض کی زنجیریں توڑنے میں ناکامی پر جبری مشقت کا شکار ہیں اور سالوں سے ادائیگیاں ہی کرتے آ رہے ہیں شاید ان کے دکھوں کا مداوا ممکن نہیں ہے۔ ان کے آقا تو بدل جاتے ہیں مگر سالوں پہلے لیے گئے قرضے کی اصل رقم جوں کی توں رہتی ہے۔ ٹھیکیدار نے پرانے مالکوں سے ہزاروں لاکھوں روپے قرض کی ادائیگی کے عوض انہیں خرید لیا۔ غلامی کے ملکی اور بین الاقوامی معاہدے ان کے حالات بدلنے میں یکسر ناکام ہیں۔ جس ٹھیکیدار نے انہیں خریدا ہے یہ اب بھی اس کے ایک تا تین لاکھ روپے کے مقروض ہیں۔ "میں دو لاکھ روپے کا مقروض تھا۔ جب ٹھیکیدار یہ ادائیگی کر کے مجھے ہری پور لے آیا اس نے یہ قرض ادا کر دیا ہے جبکہ میں تین برس سے اسے ادا کرنے کے لائق نہ ہو سکا"۔ یہ الفاظ سیہون کی ایک خیمہ بستی میں نو بچوں اور دو بیویوں کے ساتھ مقیم رب نواز کے ہیں۔

لاڑکانہ سے ہجرت کر کے آنے والے ماہی گیر علی شیر ٹھیکیدار کے ایک لاکھ روپے کا مقروض ہے۔ اس کے مطابق پانچ برس قبل اس کا خاندان گدو بیراج سندھ سے ہزارہ میں خان پور آ کر آباد ہوا۔ بڑا بھائی گل شیر تین برس سے ڈیڑھ لاکھ روپے کا مقروض ہے جبکہ والد پچھلے برس مقروض حالت میں ہی دنیا سے کوچ کر گئے۔ گل شیر کے مطابق نئی کشتیوں، ان کی مرمت اور جال وغیرہ کے اخراجات کے باعث قرض لینا پڑتا ہے۔ ٹھیکیدار کو صحت، تین وقت کھانے اور ماہی گیری کے آلات کا خرچہ اٹھانا چاہیے۔ وہ خود ہی حساب کتاب کر کے سال کے آخر میں قرض کی مد میں کثیر رقم کاٹ لیتا ہے۔

راجن پور کا غلام نبی ٹھیکیدار کے دو لاکھ روپے کا مقروض ہے اس کا کہنا ہے کہ پکڑی جانے والی مچھلی کے چھتیس یا چالیس کلو کے فقط پندرہ سو روپے ملتے ہیں جبکہ ٹھیکیدار اسے فی کلو ایک سو ستر تا دو سو روپے کے حساب سے آگے فروخت کر ڈالتا ہے۔ ماہی گیر سو جال جھیل میں ڈالے تو حاصل ہونے والی مچھلی محض پانچ تا دس کلو روزانہ ہوتی ہے۔ چونکہ کمائی اوپر نیچے ہوتی رہتی ہے لہٰذا روز کے گھریلو اخراجات نکالنا ہی مشکل ہے اور قرض کی ادائیگی تو دور کی بات ٹھہری۔ ماہ جون سے ستمبر کے وسط تک ماہی گیری پر پابندی رہتی ہے۔ اس طرح ذریعہ آمدن کی غیر موجودگی میں قرض میں زبردست اضافہ ہو جاتا ہے۔

غلام نبی اس کام سے گزشتہ چار نسلوں سے وابستہ ہے اور اپنی قسمت سے سمجھوتا کر چکا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ کوئی شے اس کی زندگی کو بدل نہیں سکتی۔ سابق وزیر اعظم بے نظیر بھٹو نے سندھ کے پانیوں میں ٹھیکیداری نظام کو اپنے دوسرے دور حکومت میں ختم کر دیا تھا اور ماہی گیر مچھلی پکڑنے اور بیچنے میں آزاد ہو گئے تھے مگر پنجاب اور خیبر پختون خواہ میں یہ ٹھیکیداری نظام استحصال کا بڑا ذریعہ بنا ہوا ہے۔

ان کے بچے بنیادی حقوق سے محروم انتہائی غربت کی زندگی گزارنے پر مجبور ہیں۔ دن رات، صبح سے شام تک پکڑی جانے والی مچھلی کو اتارنے میں والدین کی مدد کرنا، اس کے سوا ان کی کوئی مصروفیت نہیں۔ خیمے کے باہر کھڑی دس سالہ ثمینہ کم خوراکی کا شکار ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ اسکول جانے کا بے حد شوق ہے تاکہ والدین کی قسمت بدل سکے لیکن اس کا کوئی امکان نہیں۔

محنت کش حقوق کے سماجی کارکن قمر حیات ان کے لیے قانونی جنگ لڑنے کا ارادہ کر چکے ہیں۔ انہوں نے ضلعی انتظامیہ کی جبری مشقت پر گرفت میں ناکامی پر شدید تنقید کی۔ دیہی ترقیاتی پروگرام کے ایگزیکٹو ڈائریکٹر احسان خان کہتے ہیں کہ یہ ماہی گیر بین الاقوامی معاشی، معاشرتی اور ثقافتی معاہدوں اور ملکی آئین کی خلاف ورزی کرتے ہوئے کام پر رکھے جاتے ہیں۔ ہری پور کے ضلعی افسر برائے محنت عبداللہ خان کہتے ہیں کہ جبری مشقت کے خاتمے کے قانون ۱۹۹۲ کے تحت ضلعی ناظم یوسف خان کی سربراہی میں ۲۰۰۵-۲۰۰۶ء میں ایک تیرہ رکنی ضلعی نگرانی کمیٹی بنائی گئی ہے جس میں ایک سابق جج، قانون دان حضرات، مقامی حکومت کے نمائندے، محکمہ محنت و سماجی بہبود کے افسران، ذرائع ابلاغ کے نمائندے اور این جی اوز کے افراد شامل ہیں لیکن اس کا ایک بھی اجلاس نہ ہو سکا۔

محمد صداقت ترجمہ، دی ایکسپریس ٹریبون، ۱۷ جنوری ۲۰۱۲، صفحہ ۹

# غذائی عدم تحفظ

نیشنل نیوٹریشن سروے ۲۰۱۱ء کے مطابق پچھلے دس سالوں میں صوبہ خیبر پختون خواہ اور فاٹا میں خوراک کی کمی میں بہت زیادہ اضافہ ہوا ہے۔ کے پی کے میں یہ اضافہ ۴۸ء۴۳ فیصد اور فاٹا میں ۵۸ فیصد تھا (ڈان، ۲۹ نومبر، صفحہ ۸)۔ اسی سروے کے حوالے سے ملک میں خوراک کی کمی کے شکار بچوں کی تعداد ۱۵ء۱ فیصد ہے جبکہ سندھ میں یہ ۱۷ء۵ فیصد ہے (ڈان، ۱۳ دسمبر، صفحہ ۱۵)۔ عالمی بحرانوں کے متعلق ۲۰۱۱ء کی رپورٹ، جسے ریڈ کراس اور ریڈ کریسنٹ نے جاری کیا، بتایا گیا کہ شمالی سندھ میں ۳۲ء۹ فیصد اور جنوبی سندھ میں ۲۱ء۲ فیصد لوگ خوراک کی کمی کا شکار ہیں۔ اس کی بنیادی وجہ ۲۰۱۰ء اور ۲۰۱۱ء کے سیلاب اور بارش بتائی گئی۔ یونیورسٹی آف ایگریکلچر فیصل آباد کے وائس چانسلر ڈاکٹر اقرار احمد نے کہا کہ پاکستان دنیا میں غذائی عدم تحفظ کے حوالے سے گیارہویں نمبر پر آتا ہے۔ انہوں نے کہا کہ سندھ میں حالیہ سیلاب کے بعد ۷ ملین لوگ غذائی عدم تحفظ اور ۲۵ ملین لوگ غذائی کمی کا شکار ہوئے (ڈان، ۱۴ اکتوبر، صفحہ ۷)۔ غذائی بحران کی وجوہات پر روشنی ڈالتے ہوئے اسلام آباد میں خوراک کے عالمی دن کے حوالے سے مقررین نے کہا کہ قدرتی بحرانوں سے ایک طرف خوراک میں کمی واقع ہو رہی ہے تو دوسری طرف کھانے کی قیمتوں میں بے تحاشا اضافہ ہو رہا ہے جس سے غذائی اشیا کی فراہمی کے باوجود لوگ انہیں خریدنے کے قابل نہیں (ڈان، ۱۷ اکتوبر، صفحہ ۱۳)۔ محبوب الحق ڈیولپمنٹ سینٹر برائے جنوبی ایشیاء کے مطابق پاکستان میں حکومتی نظام کی کمزوری غذائی تحفظ کے لیے خطرہ بنتی جارہی ہے (ڈان، ۱۰ اکتوبر، صفحہ ۹)۔ سندھ آبادگار بورڈ نے حکومت کی ناقص زرعی پالیسی، کو پیداوار میں کمی کا ذمہ دار ٹھہرایا۔ یہ پالیسی بجائے کسانوں کے حالات بہتر کرنے کے انہیں غربت کے جال میں پھنسا رہی ہے۔ اس کی بڑی وجہ مداخل کی قیمت میں مستقل اضافہ ہے (ڈان، ۲۰ دسمبر، صفحہ ۱۸)۔

**غذائی اور نقد فصلیں:** وفاقی حکومت نے ربی کی فصل کے لیے یوریا کی ترسیل کے وعدے کے ساتھ، غذائی عدم تحفظ کے خطرے کو رد کرتے ہوئے کہا کہ گندم کے وافر اسٹاک ۸ ملین ٹن ہیں (دی نیوز، ۱۸ نومبر، صفحہ ۱۵)۔ یوریا کی ترسیل کا کیا حال ہوا اس کو تو آپ اس شمارے میں موجود یوریا کے مضمون میں دیکھیں لیکن گندم کی اگلی فصل کے حوالے سے کسانوں کا کہنا تھا کہ یہ پیداوار ۲۰۱۲ء میں ۲۰ فیصد تک کم ہو سکتی ہے کیونکہ ان کی زمین پر گنے کی فصل اب بھی کھڑی ہے۔ چینی کے مل مالکان کا مضبوط مافیا کسانوں کو وہ قیمت دینے کو تیار نہیں تھا جو کسانوں کے لیے قابل قبول ہوتی۔ حکومتی ڈیڈ لائن کے باوجود مالکان گنا خریدنے میں دیر کرتے رہے تاکہ کسان کم قیمت پر انہیں بیچنے پر مجبور ہو سکیں۔ پنجاب حکومت نے ۲۰۱۱ء میں گنے کی قیمت ۱۵۰ روپے فی ۴۰ کلو (گنا ۳ء۷۵ روپے فی کلوگرام) مقرر کی تھی۔ جبکہ کسانوں نے کم سے کم ۵ روپے فی کلوگرام کا مطالبہ کیا۔ ان کا کہنا تھا کہ زرعی مداخل کی قیمتوں میں ۳۵ فیصد سے زیادہ اضافہ ہوا ہے اور گنے کی ٹرانسپورٹیشن میں ڈیزل کی بڑھتی ہوئی قیمتوں کی وجہ سے بھی اضافہ ہوا ہے (دی ایکسپریس ٹریبون، ۸ دسمبر، صفحہ ۱۱)۔

گندم کے حوالے سے صوبہ خیبر پختون خواہ کے لوگ گندم کی افغانستان اسمگلنگ سے پریشان تھے۔ نومبر کے چند ہفتوں میں ۴۰ کلو گندم کی قیمت ۲۱۰ سے ۴۰۰ روپے ہو گئی کیونکہ صوبے کو پنجاب سے زیادہ قیمت پر آٹا خریدنا پڑا (ڈان، ۱۹ نومبر، صفحہ ۵)۔ سندھ آبادگار بورڈ نے ایک اور پہلو پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ ربی کی فصل میں کمی کا امکان ہے کیونکہ حکومت نے ابھی تک (نومبر) گندم کی امدادی قیمت کا اعلان نہیں کیا ہے (ڈان، ۲۰ نومبر، صفحہ ۱۸)۔ ۲۳ نومبر کو وزیر اعظم سید یوسف رضا گیلانی نے گندم کی امدادی قیمت ۱۰۵۰ روپے فی ۴۰ کلو مقرر کرنے کا فیصلہ کیا جس پر فلور ملز ایسوسی ایشن کی طرف سے ملک گیر ہڑتال کی دھمکی دی گئی۔ اس کے مطابق ایسوسی ایشن وہ اس مہنگے آٹے کو برآمد کرنے کے قابل نہیں رہے گی (ڈان، ۲۵ نومبر، صفحہ ۲)۔ جبکہ کسانوں کے مفاد کی ترجمانی کرتے ہوئے سندھ چیمبر آف ایگریکلچر نے مطالبہ کیا کہ زرعی مداخل میں بے تحاشا اضافے کی وجہ سے کم سے کم قیمت ۱۲۵۰ روپے فی ۴۰ کلو رکھی جائے (ڈان، ۲۶ نومبر، صفحہ ۱۸)۔ یہ کشمکش نیولبرل عالمگیریت کے دور میں حکومتی بے بسی کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

ہماری چاول اور کپاس کی فصلیں اس دفعہ بارش کے بحران کے باوجود بہت عمدہ رہیں لیکن بین الاقوامی مارکیٹ میں ان کی قیمت گرنے سے ہمارے کاشتکاروں کو نقصان اٹھانا پڑا۔ پاکستان دنیا میں تیسرا بڑا چاول برآمد کرنے والا ملک ہے۔ اقوام متحدہ کی خوراک اور زراعت کی تنظیم کے اعداد و شمار کے مطابق اس سال ہمارے ملک میں چاول کی پیداوار ۷ء۹۱ ملین ٹن تھی جو پچھلے سال کے مقابلے میں ۳۵ فیصد زیادہ تھی (ڈان، ۲۷ دسمبر، صفحہ ۹)۔ سندھ میں مقامی کاشتکاروں نے حکومت سے مداخلت کی اپیل کرتے ہوئے کہا کہ مقامی مارکیٹ میں اس وقت دھان کی فی من قیمت ۷۸۰ روپے ہے جبکہ پچھلے سیزن میں یہ قیمت ۹۵۰ روپے فی من تھی (ڈان، ۲۹ دسمبر، صفحہ ۹)۔ اسی طرح کپاس کے حوالے سے اس سال ملک کی پیداوار دسمبر تک ۱۲ء۷ ملین بیلز تھی جو ملک میں خود ایک ریکارڈ ہے۔ سندھ اسمبلی نے ٹریڈنگ کارپوریشن سے درخواست کی کہ وہ کپاس کسانوں سے خریدنا جلد شروع کرے کیونکہ کسانوں کو عالمی منڈی میں قیمت گرنے سے مقامی منڈی میں مناسب قیمت نہیں مل رہی ہے (ڈان، ۱۳ دسمبر، صفحہ ۹)۔ اسی طرح دسمبر کے مہینے میں یہ خبر آئی کہ صوبہ خیبر پختون خواہ میں کسان تمباکو کی سرکاری قیمت کے اعلان کے انتظار میں تمباکو کی اگلی فصل لگانے سے گریز کر رہے ہیں۔ حکومت کو اکتوبر کے آخر تک اس حوالے سے قیمت کو مقرر کر دینا چاہیے تھا (ڈان، ۱۲ دسمبر، صفحہ III)۔

**غذائی تحفظ اور آزاد تجارت:** پاکستان مرکنٹائل ایکسچینج (PMEX) نے جو ملک کی پہلی ویب بیسڈ اشیا کی ایکسچینج ہے اور جو سونے، چاندی، خام تیل اور اری چاول میں سودے کرتی ہے، ۳ نومبر کو اپنے اگلے سال کے معاہدوں میں گندم کو بھی شامل کر لیا (دی نیوز، ۳ نومبر، صفحہ ۱۵)۔ یہ بات اس رجحان کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ حکومت پاکستان نے اپنی زرعی پالیسی میں آزاد تجارت کو کلیدی حیثیت دے دی ہے۔ اب پاکستان کے بھاری قرض کی ادائیگی صرف نقد فصلیں ہی نہیں بلکہ غذائی فصلیں بھی کر رہی ہیں۔ اس حوالے سے پاکستان فلور ملز ایسوسی ایشن کے چیئرمین نے جنگ ایکانومک فورم کو بتایا کہ ہندوستان عالمی منڈی میں

گندم ۲۹۰ ڈالر میٹرک ٹن کے حساب سے بیچ رہا ہے، روس ۱۹۵ ڈالر فی میٹرک ٹن، قازقستان ۱۱۰ ڈالر میٹرک ٹن اور پاکستان ۳۵۰ ڈالر میٹرک ٹن۔ یعنی پاکستانی گندم مہنگی ہونے کی وجہ سے عالمی منڈی میں جگہ نہیں بنا سکتی (دی نیوز، ۳۰ نومبر، صفحہ ۵)۔

آزاد تجارت کا ایک بڑا مطالبہ یہ ہے کہ حکومتیں اپنے کردار کو کم سے کم کریں تا کہ مارکیٹ خود طلب اور رسد کے قانون کے حساب سے قیمتیں مقرر کر سکے۔ یہ آزادی قیمتوں کو کم رکھنے میں مدد دے گی۔ عالمی مارکیٹ مستقل اتار اور چڑھاؤ کا شکار رہتی ہے، ایسی صورت میں حکومت کی مداخلت ملکی پیداواری قوتوں کو استحکام دیتی ہے۔ پیپلز پارٹی کی حکومت نے اپنی تمام تر کمزوریوں کے باوجود کچھ بہتر اقدامات کرنے کی کوشش بھی کی ہے۔ مثلاً حکومت نے اپنے ساڑھے تین سالہ دور میں ۵۴۳ بلین دیہی معیشت کو مضبوط کرنے کے لیے صرف کیے جس میں کسانوں کے لیے بنیادی فصلوں کی امدادی قیمت میں اضافہ بھی شامل ہے (دی نیوز، ۴ نومبر، صفحہ ۲۰)۔ اگر حکومت کو اپنے کردار سے دستبردار کر کے صرف ٹیکس بڑھانے اور قرضے ادا کرنے کے کام پر لگا دیا جائے تو حکومت دوست نہیں، دشمن نظر آتی ہے۔ مثلاً مارچ ۲۰۱۱ء میں ٹریکٹر اور زرعی مشینری پر ۱۷ فیصد سیلز ٹیکس نے مقامی ٹریکٹر انڈسٹری کو تباہی کے دہانے پر پہنچا دیا تھا۔

حکومت کی زرعی پالیسی کسان دوست ثابت نہیں ہو رہی کیونکہ معیشت میں حکومت دراصل نیولبرل ایجنڈے کو ہی آگے بڑھا رہی ہے۔ سبزی سے لے کر پھل تک اور گوشت سے لے کر مچھلی اور مال مویشی تک تمام اشیا کی سپلائی چین عالمی تجارت کے لیے تیار کی جا رہی ہے۔ پنجاب کے وزیر اعلیٰ نے یورپین ممالک کے نمائندوں سے بات چیت کرتے ہوئے بتایا کہ ان کا صوبہ زرعی اشیا اور مال مویشی کے حوالے سے ترقی یافتہ ممالک کی منڈیوں کے معیاری شرائط کو پورا کرنے کے قابل ہو گیا ہے جس سے برآمد میں اضافہ کر کے ۲ بلین ڈالر کمائے جا سکتے ہیں (ڈان، ۱۷ دسمبر، صفحہ ۳)۔

تجارت کے لیے نئے ممالک کو پسندیدہ قرار دینے کا سلسلہ بھی جاری و ساری ہے۔ ہندوستان کے حوالے سے خبریں زیادہ گرم رہیں۔ گندم کے کاشتکاروں کی انجمن کے حامد مالکی نے کہا کہ ہندوستان کو تجارت میں پسندیدہ ملک قرار دینے سے کسانوں کو تشویش ہے کیونکہ ہندوستان اپنے کسانوں کو ۳۰ بلین ڈالر کی مراعات دیتا ہے جس کی وجہ سے ان کو اپنی اشیا کی پاکستان کے ساتھ تجارت میں سبقت حاصل ہے (ڈان، ۲۳ نومبر، صفحہ ۱۸)۔ اس مہینے کے اعداد و شمار کے مطابق پاکستان نے بذریعہ واہگہ ۲۰۱۰ء-۲۰۱۱ء میں ہندوستان سے ۲۰۹۹ بلین کی زرعی اشیا درآمد کیں جبکہ ہندوستان کو پاکستانی برآمد ۳۳۴ملین تھی۔ صرف ٹماٹر درآمد کرنے کی کل مالیت ۲۹۹ء۴ بلین تھی جو کل پاکستانی برآمدات سے تین گنا زیادہ ہے (دی نیوز، ۲۹ نومبر، صفحہ ۱۵)۔

فیڈرل بیورو آف اسٹیٹکس کے مطابق پاکستان کی کل تجارت میں خام تیل اور کھانے کی اشیا کی درآمد کے بل میں ۲۰۱۱ء-۲۰۱۲ء کے پہلے پانچ مہینوں میں اس سے پہلے سال کے مقابلے میں ۳۱ فیصد اضافہ ہوا' تجارت کے عدم توازن میں مزید اضافہ ہوا (ڈان، ۲۱ دسمبر، صفحہ ۹)۔ یہاں یہ بتاتے چلیں کہ تجارت کے عدم توازن کو یا تو ٹیکس بڑھا کے یا قرضے لے کر یا برآمدات بڑھا کر پورا کیا جاتا ہے۔ زراعت کے حوالے سے برآمدات بڑھانے کا مطلب ہے پیداوار میں اضافہ اسے عالمی معیار پر تیار کرتے ہوئے قیمت کو کم سے کم رکھنا تا کہ دوسرے ممالک سے مقابلے کے مرحلے کے بعد اسے بیچا جا سکے۔ کم قیمت کا مطلب ہے مقامی منڈی کی سطح پر کسان سے کم سے کم پر خریدنا اور پھر حکومت کا درآمدی اور برآمدی ڈیوٹی وغیرہ لگانے سے پرہیز کرنا یعنی ایک طرف کسان کی آمدنی میں کمی اور دوسری طرف حکومت کی آمدنی میں بھی بہت بڑی کمی۔ اس کمی کو آئی ایم ایف سے قرضہ لے کر پورا کیا جاتا ہے اور پھر ان قرضوں کے ساتھ عالمی ادارے نیولبرل یا آزاد تجارت کے ایجنڈے کو فروغ دینے کے لیے دباؤ بڑھاتے ہیں۔

**غربت کے خاتمے کے نسخے**: زراعت جو ڈبلیو ٹی او کے قیام (۱۹۹۵ء) سے پہلے آزاد منڈی کے عمل دخل سے محفوظ تھی اب پوری طرح اس کی زد میں آ چکی ہے۔ اسی لیے بیرونی قرضوں کی فراہمی اور دلچسپی ہماری زراعت میں بڑھتی جا رہی ہے، مثلاً:

- یو ایس ایڈ کا پاکستان کی ۵۰ سالہ تاریخ کے سب سے بڑے منصوبے کا ۲۵ نومبر کو اعلان جو ۴۵ بلین ڈالر پر مبنی ہے۔ اس میں مختلف شعبوں کے علاوہ زراعت کا شعبہ اہمیت کا حامل ہے (دی نیوز، ۲۴ نومبر، صفحہ ۲۰)۔
- عالمی بینک نے ۲۳ دسمبر کو غربت دور کرنے کے لیے ۵۵ بلین ڈالر دینے کا اعلان کیا (ڈان، ۲۴ دسمبر، صفحہ ۱۱)۔

جدید ٹیکنالوجی غربت کے خاتمے کا ایک اور نسخہ ہے۔ ایوب زرعی تحقیقاتی ادارے اور فیصل آباد یونیورسٹی کے ماہرین زراعت نے ایک تقریب میں زرعی ترقی کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ پچھلے ۲۴ سالوں میں جدید زرعی ٹیکنالوجی کے ذریعے شاندار کامیابیاں حاصل کی گئی ہیں، گندم، چاول، کپاس کی پیداوار میں زبردست، اضافہ ہوا ہے (جنگ، ۲۴ اکتوبر)۔ ایسی ترقی، تمام تر بیرونی دلچسپی اور حکومتی کاوشوں کے باوجود پچھلے چند سالوں میں غربت میں بے تحاشا اضافہ ہوا ہے لوگ مستقل خط غربت کی لکیر سے نچلی جانب لڑھک رہے ہیں۔ غربت کے خاتمے کا ایک اور نسخہ زراعت میں مائیکرو کریڈٹ ہے۔ ۲ نومبر کو اسٹیٹ بینک کے گورنر نے کہا کہ "پائیدار ترقی" کے لیے نیا مائیکرو فنانس فریم ورک ۲۰۱۱ء-۲۰۱۵ء مرتب کیا گیا ہے۔ انہوں نے بتایا کہ ابھی مائیکرو کریڈٹ صرف ۲ ملین لوگوں تک پہنچ رہا ہے جبکہ ٹارگٹ مارکیٹ ۲۵-۳۰ ملین ہے (دی ایکسپریس ٹریبون، ۳ دسمبر، صفحہ ۱۱)۔

اب ہم ذرا دیہی علاقوں میں مائیکرو کریڈٹ دینے والے بڑے اداروں کی خبروں کی طرف آتے ہیں۔ ۷ دسمبر کو یہ خبر آئی کہ سوشل موبلائزیشن یونٹ (SMU) بنانے میں ناکامی کے باوجود رورل سپورٹ پروگرام نیٹ ورک نامی ایک غیر سرکاری تنظیم جو مائیکرو کریڈٹ کے حوالے سے جانی جاتی تھی نے حکومت کو ۴ ملین روپے دینے سے انکار کر دیا ہے (دی نیوز، ۸ دسمبر، صفحہ ۱۸)۔ ۹ دسمبر کی خبر کے مطابق Pakistan Poverty Alleviation Fund (PPAF) نے ۳۰,۰۰۰ لوگوں کے لیے راجن پور، لیہ، ڈیرہ اسماعیل خان اور خیبر ایجنسی میں ۲۳۸ ملین روپے کا integrated comprehensive development پروگرام شروع کیا ہے۔ پی پی اے ایف (پاکستان پاورٹی ایلیویشن فنڈ) سرکاری شعبے کے ڈیولپمنٹ پروگرام کے بعد غریبوں کی امداد کے پروگرامز کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔ اس ادارے کو بین الاقوامی اداروں کی طرف سے بہترین کارکردگی کی ریٹنگ بھی

حاصل رہی ہے۔ اپریل ۲۰۰۰ء سے پی پی اے ایف نے ۲۰۰۰ ملین ڈالر کے منصوبوں کے لیے امداد دی، اس میں ۱۰۰ ملین ڈالر صرف مائیکرو کریڈٹ کے مد میں تھے (دی نیوز، ۸ دسمبر، صفحہ ۱۸)۔

پی پی پی کی حکومت نے خود ۲۰۰۸ء-۲۰۰۹ء میں ۳۴ بلین روپے سے بے نظیر انکم سپورٹ پروگرام (بی آئی ایس پی) شروع کیا۔ حکومت کے مطابق ملک کی آبادی کا ۴۰ فیصد غربت میں مبتلا ہے۔ (بی آئی ایس پی) نے ملتان اور سندھ کے ان اضلاع میں جہاں حکومت کے پاورٹی اسکور کارڈ کے سروے کے مطابق زیادہ سے زیادہ لوگ غربت کا شکار ہیں ۵۸ ملین لوگوں یا ۵.۳ ملین گھرانوں کو اس پروگرام کا حصہ بنایا (دی نیوز، ۲۸ دسمبر، صفحہ ۱۸)۔ یہی وہ علاقے ہیں جو پی پی پی کا ووٹ بینک رہے ہیں۔ یہاں یہ سوچنے کی بات ہے کیا ان باتوں سے غربت کی سونامی رک سکتی ہے؟ غریب کو پیسا کھی دے کر چلانے کی کوشش کبھی کامیاب نہیں ہوتی۔

# ماحولیاتی بحران

## ۲۰۰۵ء کے زلزلے اور ۲۰۱۰ء کے سیلاب متاثرین کا احوال

پاکستان تہہ بہ تہہ جن بحرانوں سے پچھلے چند سالوں میں گزر رہا ہے، غریب عوام ان کے اوپر تلے اثرات سے مستقل گزر رہی ہے۔ صوبہ پختون خواہ اور آزاد کشمیر کے زلزلے سے ۷۳,۰۰۰ کے قریب لوگ ہلاک اور ۱۲۰,۳۰۴ کے قریب زخمی ہوئے تھے جبکہ لاکھوں گھر مکمل تباہ ہوئے۔ ۷ اکتوبر کی ۲۰۱۱ء کی ایک خبر میں بتایا گیا کہ ہزاروں زلزلہ متاثرین اب بھی بے گھر ہیں، کیونکہ بڑے تعمیراتی منصوبے ابھی نامکمل ہیں یا اب تک شروع ہی نہیں ہو سکے ہیں (ڈان، ۸ اکتوبر، صفحہ ۴)۔ ۸ اکتوبر زلزلے کی یاد کے طور پر منایا جاتا ہے اس دن یہ بتایا گیا کہ صرف ضلع شانگلہ میں ۲۰۲ میں سے صرف ۳۰ اسکول دوبارہ تعمیر ہوئے ہیں اور علاقے میں ۱۵,۰۰۰ بچے اس وجہ سے بغیر تعلیم کے بیٹھے ہیں (ڈان، ۹ اکتوبر، صفحہ ۵)۔

ارتھ کوئیک ریکنسٹرکشن اینڈ ری ہیبلی ٹیشن ایجنسی (ERRA) کے مطابق اس نے آزاد کشمیر اور صوبہ خیبر پختون خواہ میں ۲۰۱۱ء کے آخر تک ۷,۹۶ منصوبے مکمل کیے ہیں جبکہ ۴,۳۲۳ منصوبوں پر کام ہو رہا ہے۔ ای آر آر اے پر امید ہے کہ وہ کل ۱۲,۰۹۵ منصوبوں کو مکمل کر پائے گی (دی نیوز، پہلی جنوری ۲۰۱۲ء) جبکہ تحریک حقوق ہزارہ کے سربراہ اصغر خان نے کہا کہ چھ سال گزرنے کے بعد بھی زلزلہ زدگان مسائل میں گرفتار ہیں۔ انہوں نے کہا کہ ای آر آر اے کی ۵ ستمبر کو جاری کی گئی رپورٹ میں یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ اس نے تعلیم میں ۳۶.۳۱ فیصد، صحت میں ۵۲.۹۴ فیصد، ٹرانسپورٹ میں ۶۰.۵۲ فیصد سماجی بھلائی میں ۱۳.۳۳ فیصد کام مکمل کیا ہے جو ملا جلا کر بحالی کے کاموں کا ۵۰ فیصد بنتا ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ یہ اعداد و شمار بھی بڑھا چڑھا کر دیے گئے ہیں (دی نیوز، ۱۰ اکتوبر، صفحہ ۵)۔ اسی طرح ۲۱ دسمبر کو اسٹیٹ ارتھ کوئیک ریکنسٹرکشن اینڈ ری ہیبلی ٹیشن ایجنسی (SERRA) کے ڈائریکٹر جنرل سید آصف حسین نے کہا کہ آزاد کشمیر میں ۴,۸۴۹ بحالی کے منصوبوں کی منظوری دی گئی تھی لیکن حکومت ۲,۰۰۰ سے زیادہ منصوبوں کے لیے رقم فراہم نہیں کر رہی (ڈان، ۲۲ دسمبر، صفحہ ۴)۔

۲۰۱۰ء کے سیلاب متاثرین کی خبروں کے حوالے سے ۱۹ اکتوبر کو بتایا گیا کہ ۸۹ میں سے ۳۹ ماڈل گاؤں سیلاب سے متاثر خاندانوں کے حوالے کر دیے جائیں گے۔ یہ گاؤں پنجاب کے وزیر اعلیٰ کے ریلیف فنڈ برائے تعمیر پاکستان سے بنائے جا رہے ہیں۔ جس میں ۵۵.۱ بلین روپے لوگوں نے امداد کے طور پر دیے ہیں جبکہ حکومت نے ۱۷ ماڈل گاؤں کے لیے زمین فراہم کی ہے۔ حکومت نے کہا کہ ۲۵۴ خاندانوں میں ۱۲ ملین روپے وطن کارڈ کے ذریعے تقسیم ہو چکے ہیں اور ۱.۲ بلین روپے سڑکوں کی تعمیر اور نہروں کی بحالی پر خرچ ہو رہے ہیں (دی نیوز، ۱۰ اکتوبر، صفحہ ۲)۔ وطن کارڈ کی تقسیم کا دوسرا مرحلہ ضلع میانوالی میں اکتوبر میں شروع ہوا جبکہ صوبہ خیبر پختون خواہ میں وزیر اعلیٰ امیر حیدر خان ہوتی نے یہ سلسلہ ڈسٹرکٹ پشاور میں ۲۱ دسمبر کو شروع کرتے ہوئے کہا کہ یہ مرحلہ دو مہینوں میں مکمل ہو جائے گا۔ صرف پشاور ڈسٹرکٹ میں ۲۷,۳۴۷ وطن کارڈ تقسیم کرنے کا پلان تھا (ڈان، ۲۲ دسمبر، صفحہ ۵)۔ اس سے پہلے نوشہرہ سے ۲۸ نومبر کو یہ خبر آئی تھی کہ وہاں سیلاب متاثرین کی بھوک ہڑتال پانچویں دن میں داخل ہو چکی ہے۔ بھوک ہڑتالیوں کا کہنا تھا کہ حکومت وطن کارڈ سیاسی بنیادوں پر تقسیم کر رہی ہے اپنی اور اتحادی پارٹی کے لوگوں کو ہی اس کا فائدہ مل رہا ہے (دی نیوز، ۲۹ نومبر، صفحہ ۵)۔ نادرا نے ۱۴ جنوری کو یہ بتایا کہ ۹۰ فیصد لوگوں کو وطن کارڈ کی دوسری قسط خیبر پختون خواہ، آزاد کشمیر اور پنجاب کے علاقوں میں شہریوں کے نقصانات کے معاوضے کے پروگرام (CDCP) کے تحت تقسیم کر دی گئی ہے (ڈان، ۱۷ جنوری، صفحہ ۴)۔

> ۱.۱ ملین
> گھرانوں کو وطن کارڈ
> سے امداد ملی: نادرا

## ۲۰۱۱ء کے بارش متاثرین کو سلام!

۲۰۱۱ء میں مون سون کی بارش سے تباہی کا تخمینہ سندھ کے وزیر اعلیٰ سید قائم علی شاہ نے ۳۵۷ بلین روپے لگاتے ہوئے کہا کہ یہ نقصان ۲۰۱۰ء کے سیلاب کے نقصان سے ۳ بلین روپے زیادہ تھا۔ (دی نیوز، ۱۵ اکتوبر، صفحہ ۱۸)۔ مالی تخمینہ ان انسانی پریشانیوں کا احاطہ نہیں کر سکتا جو ایک تباہی اپنے ساتھ لاتی ہے۔ جانی نقصان سے لے کر بڑے پیمانے پر نقل مکانی، مال مویشی، فصل کی تباہی، بیماری بھوک، افلاس ایک نہ ختم ہونے والے مسائل کی فہرست تیار ہو سکتی ہے۔ ان تباہیوں میں سب سے زیادہ متاثر عورتیں اور بچے ہوتے ہیں۔ اقوام متحدہ کے انسانی امور کے رابطہ دفتر نے سیلاب کے حوالے سے کہا کہ سندھ میں خواتین کا تحفظ سیلاب میں بری طرح متاثر ہوا (ڈان، ۱۱ نومبر، صفحہ ۸) لیکن سلام ہو ہمارے ان علاقوں میں رہنے والے عوام پر جو ۲۰۱۰ء کی سیلابی تباہی کے ایک سال بعد دوبارہ اسی قسم کی تباہی سے دوچار ہونے کے بعد بھی زندگی دوبارہ شروع کرنے کے لیے عزم و ہمت سے کام لے رہے ہیں۔ بارشیں تو ایک مہینے میں آ کے گزر گئیں لیکن ان سے پیدا شدہ مسائل آئے دن اخبارات کی سرخیوں میں شامل رہے۔ اخبارات نے حکومت کی کارکردگی سے لے کر بین الاقوامی امداد اور

متاثرین کے حالات سب ہی پر روشنی ڈالی۔

**حکومت کی کارکردگی:** اگر ہم اس سلسلے میں حکومت کی کاروائی دیکھیں تو سندھ اور وفاقی حکومت بھی اس حوالے سے بہت متحرک نظر آئیں۔ خود صدر زرداری نے ذاتی دلچسپی کا بھرپور مظاہرہ کیا۔ ایوان صدر میں اور کراچی میں اپنے گھر میں ویڈیو مانیٹرنگ سیل قائم کیے، آئندہ سیلاب کی روک تھام کے لیے مشاورت کا سلسلہ بھی شروع کیا تاکہ ماسٹر پلان اس حوالے سے تیار ہو سکے (ڈان، ۳۰ اکتوبر، صفحہ ۳)، ربی کی فصل کے لیے امدادی پلان کو فوری شروع کرنے کی ہدایت (ڈان، ۱۱ نومبر، صفحہ ۳) کے ساتھ بہت سے مسائل پر فوری ہدایت نامے بھی جاری کیے۔ اسی طرح پاکستانی فوج کے بیان کے مطابق فوج نے ۲۲,۰۰۰ لوگوں کو بچایا، ۱۲,۸۳۰ ٹن راشن لوگوں میں تقسیم کیا اور آرمی کے ڈاکٹروں نے ۹۰,۰۰۰ لوگوں کا علاج بھی کیا (دی نیوز، ۴ اکتوبر، صفحہ ۵)۔ حکومت سندھ نے اکتوبر میں وفاقی حکومت سے امداد لینے کا فیصلہ کیا جبکہ پہلی اکتوبر تک وہ خود ۵ بلین روپے سندھ سیلاب متاثر افراد کے امدادی کاموں پر خرچ کر چکی تھی (دی نیوز، ۲ اکتوبر، صفحہ ۱۸)۔ سندھ کے وزیر اعلیٰ کے مطابق حکومت نے اس کے علاوہ ۴ بلین روپے صرف مفت بیج اور یوریا تقسیم کرنے کے لیے مختص کیے تھے (دی نیوز، ۳۰ اکتوبر، صفحہ ۱۳)۔ اس حوالے سے سندھ بورڈ آف ریونیو نے ان کسانوں کی فہرست مرتب کرنی شروع کی جن کے پاس ۲۵ ایکڑ تک زمین تھی جنہیں فی ایکڑ کے حساب سے ایک بیگ بیج اور ایک بیگ فرٹیلائزر دیا جانا تھا۔ یہ تخمینہ لگایا گیا کہ تقریباً ۴,۵۶۷ میٹرک ٹن تصدیق شدہ بیج تقسیم کیے جائیں گے (ڈان، ۵ نومبر، صفحہ ۱۸)۔ ۲۵ نومبر کو چیف سیکریٹری راجہ محمد عباس کی صدارت میں ایک میٹنگ میں فیصلہ کیا کہ سیکریٹری زراعت ربی کی فصل کی امدادی پیکیج کے تحت بیج اور فرٹیلائزر کسانوں میں تقسیم کرنے کا کام سر انجام دیں گے (دی نیوز، ۲۶ نومبر، صفحہ ۱۹)۔

اسی طرح ڈائریکٹر جنرل، ہیلتھ سروسز نے کہا کہ حکومت صحت کی سہولت ہزاروں متاثرین کو فراہم کر رہی ہے اور ۱,۵۳۲,۵۱۰ مریضوں کا علاج کیا گیا ہے۔ اس کام کے لیے ۳۵ باقاعدہ اور ۱۶ موبائل میڈیکل کیمپ قائم ہوئے جہاں ۲۲۰ ڈاکٹر اور پیرا میڈیکل اسٹاف موجود تھے۔ حکومت نے بارش متاثرین کی امداد کے لیے پاکستان کارڈ کے اجراء کا کام بھی شروع کیا۔ یہ سلسلہ اکتوبر کے شروع میں شروع ہوا اور ۱۸ نومبر تک نیشنل ڈیٹا بیس رجسٹریشن اتھارٹی (نادرا) کے مطابق اس نے ۶۳۷,۱۶۲ پاکستان کارڈ کے ذریعے ۵,۱۲۹ بلین روپے تقسیم کیے (دی نیوز، ۱۹ نومبر، صفحہ ۱۴)۔ ایک کارڈ سے ایک متاثرہ خاندان کو دس ہزار روپے کی دو قسطیں ملنی تھیں۔ ایک اور مسئلہ جو حکومت کی توجہ کا مرکز بنا رہا وہ بارش کے پانی کی نکاسی کا تھا، پانی کھڑا ہونے کی وجہ سے متاثرین بارش ختم ہونے کے بعد اپنی زمین پر واپس نہ جا سکتے تھے اور نہ کوئی کھیتی باڑی ممکن تھی۔ کھڑے پانی سے بیماریوں کے پھیلنے کا خطرہ الگ تھا۔ اکتوبر کے شروع میں حکومت نے اس سلسلے میں اپنے ایک پلان کے ذریعے "۲۵ سے ۴۰ دنوں کے اندر" پانی نکالنے کے کام کو مکمل کرنے کا اعلان کیا (دی نیوز، ۲ اکتوبر، صفحہ ۱۳)۔

**بیرونی امداد:** اس سے پہلے کہ ہم حکومت کی کارگزاری کا تنقیدی جائزہ لیں ذرا ہم بیرونی امداد کا حال دیکھ لیں۔ پہلی اکتوبر کو اقوام متحدہ نے سندھ میں امدادی کاموں کے رک جانے کا خدشہ ظاہر کرتے ہوئے کہا کہ "پاکستان کے لیے ۳۵۷ ملین ڈالر کے یو این سے فوری امدادی اپیل پر اب تک صرف ۱۹ ملین ڈالر مل سکے ہیں" (ڈان، ۲ اکتوبر، صفحہ ۱)۔ یہی رونا ورلڈ ہیلتھ آرگنائزیشن (ڈبلیو ایچ او) کے پاکستان میں نمائندے کا تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ ان کا ادارہ صوبے اور ڈسٹرکٹ کی سطح پر حکومت کے ساتھ مل کر لوگوں کی جان بچانے کی کوشش کر رہا ہے لیکن ناروے، امریکہ، برطانیہ اور اسپین کے علاوہ ممالک نے ڈبلیو ایچ او کی مدد کے لیے فنڈز نہیں دیے ہیں۔ جو فنڈز ملے ہیں وہ ہنگامی ضروریات کا صرف نو فیصد پورا کر سکتے ہیں (دی نیوز، ۸ اکتوبر، صفحہ ۲۰)۔ امداد میں کھانے پینے کی اشیا صاف پانی، ٹینٹ، دوا، بیج افرادی قوت سب آئی مگر ضرورت سے بہت کم۔ امدادی اشیا میں خرد برد کی نگرانی کے لیے بھی بندوبست کیا گیا تھا ایوان بالا (سینیٹ) نے امدادی اشیا اور رقوم کی نگرانی کے لیے ایک باقاعدہ کمیٹی بنائی تھی (دی نیوز، ۱۶-۱۷ اکتوبر، صفحہ ۲)۔ اقوام متحدہ کے انسانی امور کے دفتر سے اس خطرے کو ۱۵ اکتوبر کو دوبارہ دہرایا گیا کہ نومبر کے آخر تک ۸ سے ۹ ملین لوگ سندھ اور بلوچستان میں امداد سے محروم ہو جائیں گے کیونکہ امدادی سامان اس وقت تک ختم ہو جائے گا (ڈان، ۱۶ اکتوبر، صفحہ ۱۶)۔ دوسری طرف حکومت کو یہ شکایت تھی کہ اسے صرف ۱۲ ملین ڈالر امدادی رقم اور اشیا ملی ہیں۔ باقی امداد جو یو این کی ۱۸ ستمبر کی اپیل کے بعد آئی اس میں سے ۱۵ ملین سے زیادہ اشیا اور رقم کو غیر سرکاری تنظیموں نے تقسیم کی (دی نیوز، ۲۹ اکتوبر، صفحہ ۱۲)۔ امدادی مزید تفصیل این ڈی ایم اے کے چیئرمین نے ۳ نومبر کو بتائی۔ ان کے مطابق ڈونرز نے اب تک ۲۱۶ ملین ڈالر کا وعدہ کیا ہے لیکن اس میں سے پاکستان کو صرف ۱۲۵ء۵ ملین ڈالر کیش اور گیارہ ملین ڈالر کی اشیا ملی ہیں (ڈان، ۴ نومبر، صفحہ ۳)۔ ۳۰ دسمبر تک چیئرمین این ڈی ایم اے کے مطابق یو این کی اپیل پر ۴۰ فیصد امداد مل چکی تھی (ڈان، ۳۱ دسمبر، صفحہ ۱۸)۔ پاکستان ہیومینٹرین فورم نے جو پاکستان میں ۴۱ بین الاقوامی امدادی ایجنسیوں کا ایک گروپ ہے نے ۳۰ نومبر کو اپنے ایک بیان میں امدادی ضرورت کی تصویر کشی کرتے ہوئے کہا تھا کہ "۲۰۱۱ء کے سیلاب کے سو دن گزر جانے کے بعد سندھ اور بلوچستان کے لاکھوں مرد، عورت اور بچوں کو ضروری امداد کی اشد ضرورت ہے"۔ اس سے پہلے آکسفیم کے ساتھ کچھ اداروں نے لوگوں کی ضرورت پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ "فنڈ اس وقت ختم ہو رہے ہیں جب بڑے پیمانے پر اس بیماری اور کم خوراکی سے سیلاب متاثرین کو سخت خطرہ ہے" (ڈان، ۱۶ نومبر، صفحہ ۱۹)۔ پاکستان اور اقوام متحدہ نے ۲۱ فروری کو ۴۴۰ ملین ڈالرز کی ہنگامی اپیل ("Revised Flash Appeal") کی۔ یہ اپیل نقصانات کے سروے کے بعد کی گئی اس سروے میں عالمی بینک اور ایشین ڈیولپمنٹ بینک نے ۸ شعبوں کی نشاندہی کی جن میں نکاسی آب، صحت، پانی، خوراک، تعلیم اور گھروں کی تعمیر شامل تھی (دی ایکسپریس ٹریبیون، ۲۸ فروری، صفحہ ۱۴)۔

**متاثرین کی حالت زار:** نومبر میں سول سوسائٹی اکاؤنٹیبلیٹی کمیشن (CSAC) نے اپنی ایک رپورٹ جاری کرتے ہوئے حیدرآباد میں کہا کہ بارش سے متاثر افراد کے مسائل کے حوالے سے حکومت اب بھی مناسب توجہ نہیں دے رہی ہے۔ رپورٹ میں کہا گیا کہ بارش نے نا صرف خریف کی فصل تباہ کر دی بلکہ لاکھوں افراد کو جنوبی سندھ میں نقل مکانی پر مجبور ہونا پڑا۔ اس میں سے زیادہ تر متاثرین کھلے آسمان تلے زندگی گزار رہے ہیں۔ ۰۰۰,۷ گاؤں

سیلاب میں بہہ گئے اور علاقے کا انفراسٹرکچر بالکل تباہ ہوگیا جبکہ ۱۰۰۰ سے زائد افراد کا جانی نقصان ہوا جس کا ذمہ دار کمیشن نے عالمی بینک کو ٹھہرایا کیونکہ زیادہ تر تباہی بدین، سانگھڑ اور میرپورخاص کے علاقوں میں ہوئی جو ایل بی او ڈی کے کمانڈ ایریا میں ہیں۔ کمیشن نے حکومت پر زور دیا کہ وہ عالمی بینک سے ہرجانہ طلب کرے (ڈان، ۹ نومبر، صفحہ ۱۴)۔ کمیشن نے وفاقی اور صوبائی حکومت پر امدادی اشیا کی تقسیم میں برابری اور شفافیت کو بالائے طاق رکھنے کا الزام بھی لگایا۔ حکومت کے سیاسی مخالفین اور خود سیلاب متاثرین نے مظاہرہ کرکے امدادی اشیا کی تقسیم میں دھاندلی کی نشاندہی کی۔ اکتوبر تک متاثرین کی طرف سے فوری طور پر ٹینٹ، خوراک، پانی اور صحت کی سہولت کا مطالبہ کیا جاتا رہا جبکہ دسمبر میں متاثرین کے کچھ حلقوں نے مظاہرے کرکے یہ باور کرایا کہ انہیں اب امداد ملنی بند ہوگئی ہے (ڈان، ۸ دسمبر، صفحہ ۱۸)۔ سندھ کے چیف سیکریٹری راجہ محمد عباس کو ایک اعلیٰ سطح کی میٹنگ میں آبپاشی اور صوبائی ڈیزاسٹر مینجمنٹ اتھارٹی (پی ڈی ایم اے) نے بتایا کہ میرپورخاص، سانگھڑ، عمرکوٹ، ٹنڈو الہ یار اور بدین میں ۲۰ اکتوبر تک ۳۱۴,۳۱۷ ٹینٹ، ۳,۰۲۷,۰۲۲ راشن کے پیکٹ اور ۵۵,۳۸۱ کمبل تقسیم کیے جاچکے ہیں جبکہ عالمی صحت کے ادارے نے ۱۴۸۰,۰۰۰ افراد کو ضروری ادویات فراہم کی ہیں۔ صوبے میں تقریباً ۲٫۹ ملین متاثرین کی خوراک کی ضرورت کو پورا کیا گیا ہے (دی نیوز ۲۴ اکتوبر، صفحہ ۱۵)۔ حکومت کے دعوؤں کے باوجود پیپلز اکاؤنٹی بلیٹی کمیشن (پی اے سی) نے اپنی ایک رپورٹ میں کہا کہ ۲۷ فیصد متاثرہ افراد خوراک کی کمی کا شکار ہیں۔ جس میں حاملہ عورتیں اور بچے سب سے زیادہ متاثر ہیں۔ ان متاثرین میں ملیریا، پیچش، ہیضہ اور سانس کی بیماریاں عام ہیں (ڈان ۱۹ جنوری، صفحہ ۱۸)۔ سانگھڑ میں ۲۸ فروری کو سیلاب زدگان نے پیپلز ڈیولپمنٹ انیشی ایٹو (پی ڈی آئی) اور پی اے سی کے ساتھ ایک مظاہرے میں رہائش، خوراک، صحت اور تعلیم کی سہولیات کا مطالبہ کرتے ہوئے کہا کہ سیلاب سے متاثر لوگوں کی ۳۰ فیصد زمین اب بھی زیرآب ہے اور ان کے پاس اتنے ذرائع نہیں کہ وہ یہ پانی اپنی زمین سے نکال سکیں۔

نومبر کے آخر میں اقوام متحدہ کے انسانی امور کوآرڈینیشن کے دفتر نے کہا کہ سیلاب متاثرین میں سے صرف آٹھ فیصد کو سردی کے کپڑے فراہم کیے گئے ہیں اس کی وجہ سے سندھ اور بلوچستان میں یہ افراد بیماری کا زیادہ شکار ہوں گے (دی نیوز، ۲۸ نومبر، صفحہ ۲)۔ ایک مہینے کے بعد یہ خبر آئی کہ تھر میں سخت سردی میں لوگ ٹینٹ میں یا ریت کے ٹیلوں پر کھلے آسمان تلے رہ رہے ہیں، زیادہ تر لوگ بے زمین کسان اور مزدور ہیں روزگار نہ ہونے کی وجہ سے وہ اور ان کے خاندان فاقوں کی زندگی گزار رہے ہیں (ڈان، ۲۱ دسمبر، صفحہ ۱۸)۔ اس سے پہلے میرپورخاص، عمرکوٹ، سانگھڑ اور بدین سے یہ خبر آئی تھی کہ یہاں پر ہزاروں افراد نے عید کھلے آسمان تلے گزاری۔ انہوں نے کہا کہ صرف ۲۰ فیصد کے پاس ٹینٹ وغیرہ ہیں۔ ان افراد نے یہ امکان ظاہر کیا کہ جنوری تک ان کے علاقوں میں کھیتی باڑی کرنا ناممکن ہے کیونکہ یہ علاقے بڑی بڑی جھیلوں میں تبدیل ہوچکے ہیں۔ جہاں سانپوں کے علاوہ درختوں پر مکڑیوں نے قبضہ کرکے انہیں اپنے بڑے بڑے جالوں سے ڈھانپ دیا ہے (دی نیوز، ۱۵ نومبر، صفحہ ۱۹)۔ نکاسی آب کے مسئلے کی نشاندہی کرتے ہوئے ۲ دسمبر کو بدین پریس کلب پر مظاہرین نے کہا کہ بدین ڈسٹرکٹ کے ۴۰ گاؤں میں چھ فٹ اونچا پانی کھڑا ہے۔ پہلی دسمبر کو سیلاب متاثرین نے کنڈیاری سے میرپورخاص پریس کلب تک ایک ریلی نکالی۔ انہوں نے کہا کہ ۲۵,۰۰۰ ایکڑ زرعی زمین پر پانی کھڑا ہے جس کی وجہ سے کسان گندم کا بیج نہیں بوسکتے (ڈان، ۱۰ دسمبر، صفحہ ۱۸)۔ یہاں یہ بھی بتاتے چلیں کہ ۲۷ اکتوبر کو سپریم کورٹ کو بھی یہ کہا گیا تھا کہ سیلاب کا پانی سندھ کے وسیع رقبے پر کھڑا ہے کیونکہ حکومت نے اس وقت تک دریائے سندھ کے پانی سے صرف ۳۰ فیصد رکاوٹوں کو ہٹایا تھا (ڈان، ۲۸ اکتوبر، صفحہ ۱۴)۔ اسی مہینے ایل بی او ڈی کے حوالے سے ایک خبر میں بتایا گیا کہ میرپورخاص میں بااثر افراد، جن میں پارلیمنٹ کے ارکان بھی شامل ہیں، رکاوٹیں کھڑی کرنے کے ذمہ دار ہیں (ڈان، ۱۴ اکتوبر، صفحہ ۱۸)۔ سندھ کے خوراک کے وزیر میر نادر مگسی نے ۲۲ جنوری کو اس بات پر زور دیا کہ اگر پانی کے قدرتی بہاؤ کو برقرار رکھا جاتا تو جنوبی سندھ میں بارش سے سیلاب نہ آتا (ڈان ۲۳ جنوری، صفحہ ۱۶)۔ سندھ حکومت نے ایل بی او ڈی کے نیٹ ورک کی مضبوطی اور مرمت کے لیے ۱۷ فروری کو ۱۰٫۵ بلین روپے کی منظوری دیتے ہوئے اعلان کیا کہ یہ کام جون ۲۰۱۲ تک مکمل ہوجائے گا (ڈان، ۱۸ فروری، صفحہ ۱۸)۔ ایل بی او ڈی پر چھ رکنی کمیٹی نے سیڈا پر لاکھوں روپے کی بدعنوانی کا الزام لگاتے ہوئے کہا کہ کمیٹی تین مرتبہ سے سیڈا کے ساتھ میٹنگ کا بائیکاٹ کررہی ہے کیونکہ سیڈا پانی پر آبیانہ اور دوسرے اخراجات وصول کرنے میں کسانوں کے اداروں اور علاقے کے پانی کے بورڈ کو اعتماد میں نہیں لیتی اور نہ ہی شگاف بھرنے وغیرہ کے کام میں مناسب طریقے سے دلچسپی لے رہی ہے۔ اس کی نظریں اس ماسٹر پلان پر ہیں جسے صدر پاکستان کے کہنے پر ایم/ایس لوئیس برجر گروپ M/S Louis Berger Group نے حکومت کے ساتھ مشاورت سے بنایا ہے۔ کسانوں اور علاقے کے واٹر بورڈ کے ممبران کا کہنا ہے کہ اس سلسلے میں علاقے کے لوگوں کو اعتماد میں لینا ضروری ہے (ڈان، ۱۳ مارچ، صفحہ ۱۸)۔

اب ہم آتے ہیں بیج اور کھاد کے حکومتی وعدوں کی طرف۔ بدین کے کسانوں کو شکایت تھی کہ انہوں نے زمین تیار کرلی ہے مگر وہ مداخل خریدنے کے قابل نہیں۔ انہوں نے کہا کہ حکومت نے ربی کی فصل کے لیے مفت بیج اور کیمیائی کھاد کا وعدہ کیا تھا وہ ابھی تک وفا نہیں ہوسکا ہے (ڈان، ۱۸ نومبر، صفحہ ۱۸)۔ سندھ کسان تنظیم کے صدر جاوید احمد جونیجو نے ۲۵ نومبر کو بتایا کہ سرکار کو میرپورخاص میں ۳۶۰,۰۰۰ بیج کے بیگ فراہم کرنے تھے لیکن صرف ۴۰,۰۰۰ بیگ تقسیم کیے گئے ہیں (ڈان، ۲۶ نومبر، صفحہ ۱۸)۔ کسانوں کے مظاہرے اس حوالے سے دسمبر کے آخر تک جاری رہے (ڈان، ۲۱ دسمبر، صفحہ ۱۸)۔ جنوری میں سندھ آبادگار بورڈ کے صدر مجید نظامانی نے بتایا کہ سندھ کے بارش سے متاثرہ علاقوں کو ۱۲٫۶ بلین روپے کے نقصان کا سامنا ہے کیونکہ گندم کی کاشت چار سو ہزار ایکڑ پر نہیں ہوسکے گی (دی نیوز، ۱۵ جنوری، صفحہ ۱۵)۔ سندھ چیمبر آف ایگریکلچر کے امداد تالپور نے کہا کہ گندم کے بیجوں کی سپلائی میں دیر اور پانی کی نکاسی میں تاخیر کے باعث سندھ حکومت کو اب سورج مکھی کا بیج سپلائی کرنا چاہیے تاکہ خوردنی تیل کی درآمد میں کمی لائی جاسکے (دی ایکسپریس ٹریبیون، ۱۷ دسمبر صفحہ ۱۱)۔ میرپورخاص، عمرکوٹ اور دوسرے اضلاع میں اس سورج مکھی کے بیج نے کیا گل کھلایا اس کا بیان کچھ یوں ہے:

## سنجینٹا کی ناقص بیج: سیلاب سے متاثر کسانوں کا ایک اور امتحان

میرپورخاص، عمرکوٹ اور دوسرے قریبی اضلاع میں کئی سو کسانوں نے بارشوں سے اپنی کپاس کی فصل کی تباہی کے بعد سورج مکھی اگانے کا فیصلہ کیا تا کہ وہ اپنے نقصانات کا ازالہ کر کے اپنی پچھلی فصل کے قرضے واپس کر سکیں۔ ان کی زمینوں پر پانی کھڑا تھا جس پر سورج مکھی ہی کی فصل ہو سکتی تھی۔ انہوں نے سنجینٹا اور آئی سی آئی کے ہائی برڈ بیج اپنی زمین پر بوئے۔ سورج مکھی کا پھول بیج سے بھرا ہوتا ہے مگر ان سورج مکھی کے پودوں کے پھولوں میں بیج نہیں تھے اگر تھے بھی تو بہت کم اور پتھر کی طرح سخت۔ کسانوں کے مطابق وہ ایک من فی ایکڑ بھی نہ نکال پائے۔ یہ ہزاروں کسان اس طرح ایک فصل کی تباہی کے بعد دوسری تباہی سے بھی دوچار ہوئے۔ اگر پہلی تباہی کی بنیادی ذمہ داری عالمی بینک کے مشوروں سے بنائے گئے ایل بی او ڈی پر جاتی ہے تو دوسری تباہی کی ذمہ داری بھی ان عالمی کمپنیوں پر ہے جو سیلاب زدگان کو ناقص بیج بیچ کر منافع کمانا چاہتی تھیں۔ حکومت کے سیڈ سرٹیفیکیشن ادارے بھی شائد اس لوٹ میں شامل رہے۔ کسانوں کی تنظیموں نے مطالبہ کیا کہ ذمہ دار قوتوں کے خلاف شفاف انکوائری اور متاثرہ کسانوں کے نقصان کا ازالہ کیا جائے۔ موسمی تبدیلی کی آفتوں میں بھی زندگی کو جاری رکھنے کے لیے کسانوں کی تمام تر کوششوں کے باوجود اگر انہیں ناانصافی کا ہی سامنا رہا تو وہ وقت دور نہیں جب وہ اپنے حق کے لیے، جدوجہد کی قوت بھی اپنے اندر پیدا کر لیں اور یہی قوت دراصل انہیں غلامی سے آزادی دلائے گی۔

اسی طرح بارش متاثرین کو پاکستان کارڈ حاصل کرنے میں کیا دشواریاں ہوئیں ان میں سے کچھ کا خلاصہ آگے پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

## پاکستان کارڈ

۸ جنوری کو جھڈو بچاؤ کمیٹی کے ذوالفقار قائم خانی کی طرف سے ایک پریس کانفرنس میں کہا گیا کہ جھڈو، ٹنڈو محمد خان، نوکوٹ اور ڈگری کے ۸۰ فیصد لوگوں کو اب تک پاکستان کارڈ نہیں مل سکا ہے۔ یہاں پر پانچ سو ہزار افراد بارش سے متاثر ہوئے اور دو سو ہزار نے نقل مکانی کی اور ان میں سے اب بھی بہت سے آسمان تلے زندگی گزار رہے ہیں۔ پانی کی نکاسی نہ ہونے کی وجہ سے یہ لوگ کشتی میں آتے جاتے ہیں اور انہیں ربی کے بعد خریف کی فصل لگانے کے امکانات نظر نہیں آ رہے ہیں۔ اس سے پہلے ۲۰ دسمبر کو عوامی اکاؤنٹی بلیٹی کمیٹی نے سیلاب متاثرین کے حوالے سے اپنی پانچویں رپورٹ میں پاکستان کارڈ کے حوالے سے کہا کہ بہت سارے لوگ جنہیں کارڈ مل گئے ہیں انہیں امداد کی پہلی قسط ابھی تک نہیں مل سکی ہے (ڈان ۲۱ دسمبر، صفحہ ۱۸)۔ کارڈ حاصل کرنا اور اس سے رقم نکالنا بارش متاثرین کے لیے کتنا مشکل تھا یہ ایک الگ کہانی ہے۔ ۱۵ نومبر کو یہ خبر آئی کہ نادرا کے سینٹر کے سامنے قطار میں کھڑے کھڑے ایک آدمی دم گھٹنے سے چل بسا (ڈان ۱۲ نومبر، صفحہ ۱۸)۔ ۲۴ نومبر کو ایک اور خبر سے پتہ چلا کہ چار سیلاب متاثرین پولیس کے لاٹھی چارج سے سخت زخمی ہو گئے۔ پاکستان کارڈ کی تقسیم کے دوران عمرکوٹ کے ڈپٹی کمشنر نے کہا کہ ان کے علاقے میں اے ٹی ایم کی سہولت صرف دو بینکوں کے پاس ہے جو سیلاب زدگان کا ہجوم برداشت نہیں کر سکتے۔ سیلاب زدگان لمبی قطاروں میں کبھی پورا دن کبھی اس سے بھی زیادہ کھڑے رہتے تب کہیں کارڈ کے ذریعے نقد رقم مہیا ہوتی تھی۔ اس لمبے انتظار کی وجہ یہ تھی کہ حبیب بینک جہاں سے رقوم حاصل ہوتی تھیں وہ بغیر نادرا کی تصدیق کے یہ پیسے جاری نہیں کر سکتا تھا۔ اس میں بھی شناختی کارڈ کے حوالے سے مسئلے آتے تو کبھی انگلیوں کے نشان ملنے میں دشواری ہوتی (ڈان، پہلی نومبر، صفحہ ۱۸)۔

# سامراجی قوتوں کا ایک نیا جال: سبز معیشت

ماحول کی تباہی اور موسمی بحران سے نمٹنے کے لیے سرمایہ داری نظام اب تیل، گیس اور کوئلے پر مبنی براؤن معیشت سے سبز معیشت کی طرف پلٹ رہا ہے۔ ۲۰ جون ۲۰۱۲ء کو برازیل کے شہر ریوڈی جنیرو میں ۲۰ سال بعد پھر عالمی سربراہان ریو پلس ۲۰ کے اجلاس کے لیے اکٹھا ہو رہے ہیں۔ سبز معیشت پائیدار ترقی کے نعرے کے ساتھ غربت کے خاتمے، ماحول کی تباہی اور موسمی بحران پر قابو پانے کا دعویٰ تو کرتی ہے لیکن در پردہ اس کا مقصد مسائل میں گرفتار سرمایہ داری نظام کو سہارا دے کر اسے دوبارہ مضبوط کرنا ہے۔ ہم (چھوٹے اور بے زمین کسان) ریو ۲۰ کے ایجنڈے کی جن بنیادوں پر مذمت کرتے ہیں ان میں سے کچھ مندرجہ ذیل ہیں:

جاندار اشیا پر کسی کی اجارہ داری نہیں ہو سکتی لیکن ۱۹۹۵ء سے عالمی تجارتی ادارے (ڈبلیو ٹی او) نے ذہنی ملکیت کے معاہدے (ٹرپس) کے تحت اس بات کی اجازت دی ہوئی ہے۔ سبز معیشت کے لبادے میں قدرت کی ہر جاندار چیز کو کمپنیاں اپنے حق ملکیت میں لانے کی تیاری کیے بیٹھی ہیں۔ قدرت میں پائے جانے والی زندہ اقسام میں جینیاتی تبدیلی کرکے اس پر اپنا حق منوائیں گی۔ مثلاً بی ٹی بیج، خوراک جیسے مکئی، ٹماٹر، چاول، گندم اور دیگر جاندار اشیاء پر اب کمپنیوں کا راج ہوگا۔ اس کے علاوہ سرمایہ داری نظام اب یہ بحث اٹھا رہا ہے کہ قدرت میں پائے جانے والی اشیاء کا بے جا استعمال کیا جاتا ہے۔ اگر قدرت کو محفوظ کرنا ہے تو ضروری ہے کہ اس میں پائے جانے والی اشیاء اور اس سے حاصل ہونیوالی خدمات پر رقم لگائی جائے تاکہ قدرتی اشیا اور خدمات استعمال کرنے والے بے دریغ فائدہ نا اٹھائیں۔ قدرتی خدمات میں کئی طرح کی خدمات گنوائی جاتی ہیں مثلاً پودے اور جانوروں سے بیج کے پھیلنا (پولینیشن) پانی کا قدرتی بہاؤ جو کہ پورے ماحول کو خاص کرکے زمین کو زرخیز کرتا ہے۔ اس کے علاوہ روایتی بیج اور تنوع حیات میں چھوپا ہوا بیش بہا جینیاتی مواد سب کو قدرتی خدمات میں گنوایا جاتا ہے۔ دراصل قدرتی خدمات کو گنوا کر ان کے اوپر رقم درج کرنا سرمایہ داری کی ایک چال ہے تاکہ وہ عوام سے اس کے دام وصول کرسکے۔ دراصل قدرت نے سارے وسائل انسانی خدمت کے لیے پیش کیے ہیں۔ جن کو کئی ہزار سالوں سے دنیا کے باسی ایک طرف ضرورت کے تحت استعمال کرتے رہے ہیں اور دوسری طرف ان کی نگہداشت کرتے ہوئے آنے والی نسلوں کے لیے سنبھالتے ہیں۔ سرمایہ داری کے مفاد فرق ہیں، اس کا مقصد شے اور خدمت دونوں کا استحصال کرتے ہوئے ان سے منافع کمانا ہے۔ مثلاً جیو انجینئرنگ ایک اور نیا شعبہ ہے جہاں سمندر کی تہہ سے لے کر زمین اور فضا تک گلوبل وارمنگ کم کرنے کے لیے سورج کی روشنی کو روکنے کے بہانے ہر جگہ سرمایہ کاری کرکے منافع کمانے کے نئے مواقع سامنے آئیں گے۔ یہ سب کچھ کرہ ارض کو کیسے متاثر کرے گا اس سے کسی کو کوئی سروکار نہیں۔

---

### زمین کے درجہ حرارت میں اضافے (گلوبل وارمنگ) کی وجوہات

- گلوبل وارمنگ کی بنیادی وجہ امیر ممالک میں صنعتی پیداوار اور گاڑیوں کی بڑے پیمانے پر آمدورفت ہے۔
- اس لیے کاربن گیس کے اخراج (جس کی وجہ سے گلوبل وارمنگ ہوتی ہے) کم کرنے کی ذمہ داری ہر ملک پر برابر عائد نہیں ہوسکتی ہے۔
- تیسری دنیا کے غریب ممالک یقیناً پچھلے ۱۵۰ سال سے کاربن گیس کے اخراج کے ذمہ دار نہیں تھے۔

---

دنیا میں شہری آبادی میں اضافے اور سبز انقلاب کی زراعت کے اثرات کی وجہ سے قابل کاشت زمین کم ہو رہی ہے۔ اس صورتحال میں سبز معیشت نے یہ حل دیا ہے کہ اب پودوں کی پیداوار ہوا اور پانی پر ہوگی زمین پر نہیں۔ زراعت کے رخ کو زمین سے ہٹا کر صحیح معنوں میں صنعتی زراعت کی طرف موڑا جا رہا ہے۔ ایک نئے طرز کی خوراک کی پیداوار کا طریقہ کار متعارف کرایا گیا ہے جس کو ہائیڈروفونکس (hydrophonics) کہا جاتا ہے۔ اس طریقہ کار کے تحت کاشتکاری فیکٹریوں میں کی جائے گی جہاں پودوں کو کمپنیوں ہی کے بنائے گئے غذائی اجزا (micronutrients) کے ذریعے پروان چڑھایا جائے گا۔ ایسی زراعت کو آرگینک زراعت کے طور پر پیش کیا جا رہا ہے۔ آرگینک زراعت کو کیمیائی اشیاء سے پاک کہہ کر فروغ دیا جا رہا ہے۔ لیکن دراصل آرگینک فارمنگ اب سرمایہ داری نظام کے لیے منافع کمانے کا نیا سلسلہ ہے۔ روایتی زراعت دراصل بالکل فرق طریقہ کار ہے جو کہ ماحول میں پائی جانے والی تنوع حیات سے جڑ کر موجودہ غذائیت کو حاصل کرتے ہوئے بہتر بیج اور غذا دونوں کی پیداوار کا سلسلہ جاری رکھتا ہے۔ یہ طریقہ زراعت انسانی ضروریات کے ساتھ ساتھ ماحولیاتی اور ماحول میں پائے جانے والے تمام جانداروں کی ضروریات میں توازن رکھتا ہے۔ آرگینک فارمنگ کا خیال شروع میں بہتر غذا حاصل کرنے کے حوالے سے مغربی ممالک نے سبز انقلاب کی غذائی پیداوار سے تنگ آکر ڈھونڈا تھا۔ سرمایہ داری نظام نے اس خیال کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اس کو منڈی سے جوڑ لیا اب اس لفظ کا فائدہ اٹھاتے ہوئے صرف کیمیائی اجزاء سے پاک غذائی پیداوار کو آرگینک فارمنگ کہا جا رہا ہے جو کہ نا ماحولیات کے توازن کو سامنے رکھتی ہے اور نا اس ماحول میں پیدا ہونے والی غذا میں پائے جانے والی غذائیت کو اہمیت دیتی ہے۔ آرگینک زراعت سے پیدا کی گئی خوراک ماحول سے ہم آہنگ نہ ہونے کی وجہ سے نہ تو فائدہ مند ہوگی اور نا ہی مزیدار۔ ہائیڈروفونکس سے پیدا کی گئی خوراک سے نہ صرف انسانی صحت خراب ہوگی بلکہ یہ حیاتیاتی تنوع کی تباہی اور کسان کی زراعت سے بے دخلی کو بھی یقینی بنائے گی۔

بائیو فیول کو بھی پائیدار زراعت اور متبادل توانائی کے طور پر پیش کیا جا رہا ہے۔

براؤن معیشت میں تیل، کوئلے اور گیس کے ذخائر کام آئے۔ اب سبز معیشت میں زرعی زمین کام آئے گی۔ ۲۰۰۸ء میں خوراک کا بحران بنیادی طور سے زمین کے بڑے رقبے پر غذائی پیداوار (مکئی) کو بطور ایگرو فیول استعمال کرنے سے آیا تھا۔ ایسی زراعت زمین اور اس پر موجود پانی پر دباؤ بڑھا کر بھوک میں اضافے کا باعث ہوتی ہے، اس کے خاتمے کا نہیں۔ اسے پائیدار زراعت کیسے کہہ سکتے ہیں؟ اب جہاز ایگرو فیول پر چلیں گے اور غذائی فصلیں ہوا اور پانی پر اگائی جائیں گی۔ زمیندار اپنی زمین بڑی بڑی کمپنیوں کو لیز پر دیں گے اور منافع خوری کے اس کھیل میں کسان اور ماحول دونوں تباہ ہوں گے۔

پہلی ریو کانفرنس ۱۹۹۲ء میں منعقد ہوئی تھی۔ اس کے تین سال کے بعد ڈبلیو ٹی او ۱۹۹۵ء میں قائم ہوا۔ ۱۹۹۲ء میں کیونکہ ٹرپس کا ذہنی ملکیت کا معاہدہ مکمل ہو کر قانونی حیثیت نہیں رکھتا تھا اس لیے ریو کانفرنس کے بحث و مباحثے اور نتائج میں اس کو کوئی جگہ نہیں دی گئی۔ اب ۲۰ سال کے بعد ریو+۲۰ کے انعقاد ہونے والا ہے اور سرمایہ دار ممالک اور ان کی دیوہیکل کمپنیاں چاہ رہی ہیں کہ اس ۲۰ سال کے عرصے میں جو کئی طرح کی ٹیکنالوجیز ایجاد کر لی گئی ہیں ان پر ذہنی ملکیت کے معاہدے کو لاگو کرتے ہوئے منافع کمانے کا ذریعہ بنایا جائے۔

ماحولیاتی مسائل کو بہانہ بناتے ہوئے سبز معیشت کا ڈھونگ رچایا جا رہا ہے۔ اس نئے پالیسی ایجنڈا میں کئی نئی طرح کی "سبز ٹیکنالوجیوں" کو پیش کیا جا رہا ہے۔ ترقی یافتہ سامراج پسند ممالک نے اپنی گرتی ہوئی معاشی حالت سے نمٹنے کے لیے یہ نیا حل ڈھونڈا ہے۔ لیکن کیا اس پسے ہوئے طبقے سے، جو کہ سب سے زیادہ ماحولیاتی بحران کی زد میں آیا ہوا ہے، کسی نے ان مسائل کا حل پوچھا؟ سرمایہ دارانہ ٹیکنالوجیاں آمر طبقے کے لیے منافع تو کما کر دے سکتی ہیں لیکن مقامی آبادیوں اور عوام کے لیے مسائل کا حل نہیں دے سکتی۔ یقیناً مسائل چاہے معاشی ہوں، ماحولیاتی یا سیاسی، عوام خود ہی ان کے حل کے بہتر راستے نکال سکتے ہیں۔

### ۲۰۰۸ میں کل کاربن اخراج میں دنیا کے مختلف ممالک کا حصہ*

| ملک | کاربن اخراج فیصد | آبادی |
|---|---|---|
| چائنہ | ۲۳٫۳۳ | ۱٫۳ بلین |
| امریکہ | ۱۸٫۱۱ | ۳۱۴ ملین |
| یورپی یونین | ۱۴٫۰۴ | ۵۰۰ ملین |
| ہندوستان | ۵٫۷۵ | ۱٫۲ بلین |
| تھائی لینڈ | ۰٫۹۵ | ۶۹ ملین |
| ملیشیاء | ۰٫۶۹ | ۲۸ ملین |
| پاکستان | ۰٫۵۴ | ۱۷۳ ملین |

اگر ممالک کی آبادی کے لحاظ سے دیکھیں تو ہندوستان اور چائنہ دنیا کی تقریباً ۳۶ فیصد آبادی رکھتے ہیں لیکن ۳۰ فیصد سے کم کاربن اخراج دنیا میں پھینکتے ہیں۔ جبکہ امریکہ اور یورپی یونین کل ۱۱٫۶ فیصد آبادی رکھتے ہوئے تقریباً ۳۲ فیصد کاربن اخراج دنیا میں پھینکتے ہیں۔

* http://en.m.wikipedia.org/wiki/List_of_countries_by_carbon_dioxide_emissions#section_2